www.urduchannel.in

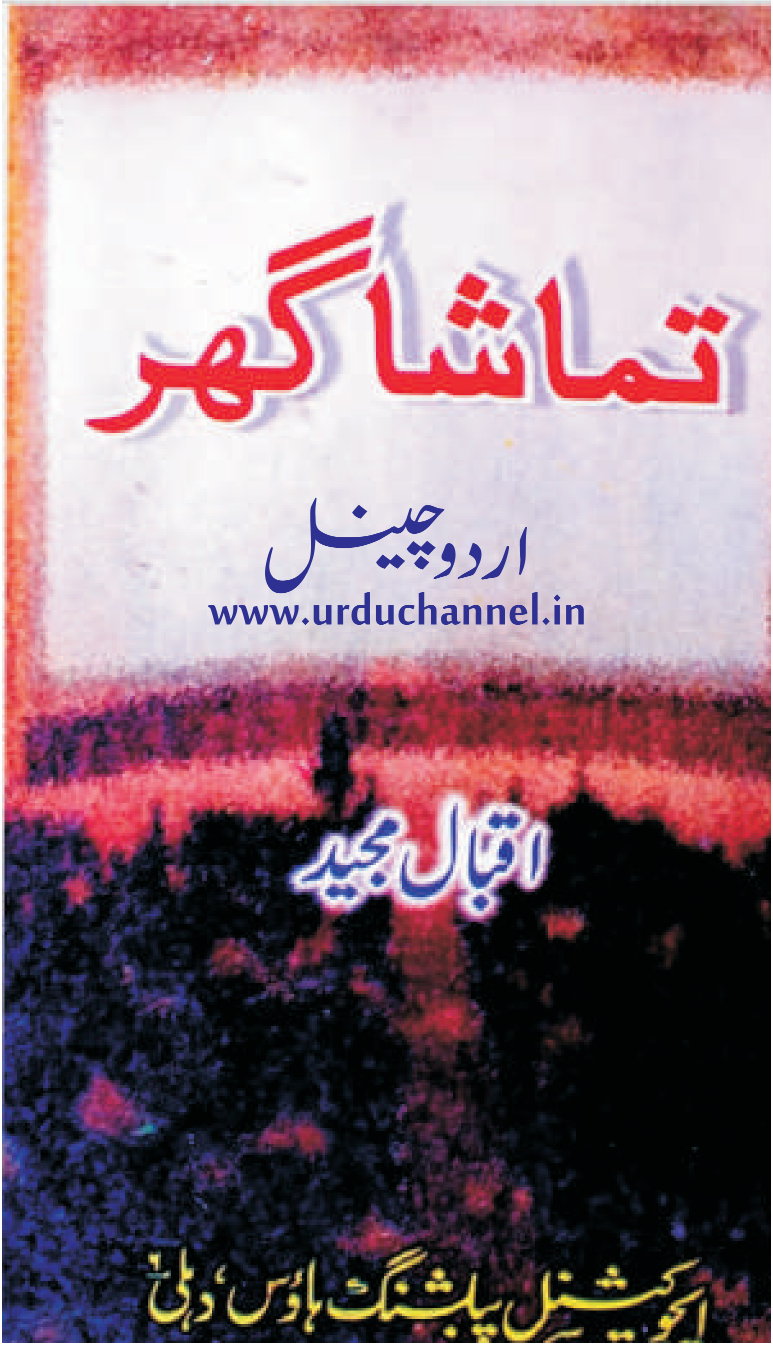

www.urduchannel.in

تماشا گھر

MD NADEEM IQBAL

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

تماشا گھر

(افسانوی مجموعہ)

اقبال مجید

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

آخری مجموعہ

اپنے بیٹے

ارشد اقبال عرف رُومی

کے نام کرتا ہوں

جو اسے اٹک اٹک کر تھوڑا بہت پڑھ سکتا ہے

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

فہرست

۱۔	سخت جانوں کا انتظار	۹
۲۔	سوختہ ساماں	۲۶
۳۔	بے شمار	۳۹
۴۔	ہم گریہ سر کریں گے	۴۶
۵۔	سوراخ	۶۳
۶۔	چیلیں	۷۲
۷۔	دو بھیگی آنکھیں	۷۸
۸۔	اُلّو کا گھر	۹۰
۹۔	تماشا گھر	۱۱۳
۱۰۔	بے صورتی کی صورتیں	۱۲۰
۱۱۔	سایۂ شجر	۱۳۶
۱۲۔	طلائی مُہر	۱۴۷

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

سخت جانوں کا انتظار

اب صغریٰ بیگم نے بند مٹھی سے دی جانے والی صدقہ خیرات کی رقموں پر پلنا شروع کردیا تھا۔کئی گھر ایسے تھے جہاں وہ میلا سا برقعہ اوڑھے لکڑی ٹیکتی جھکی کمر کے ساتھ آنگن میں داخل ہوتیں، کچھ دیر چار پائی پر بیٹھ کر سانسوں کو قابو میں لاتیں، ایک کٹورا ٹھنڈا پانی پی کر دم لیتیں۔اور جب ایک بند مٹھی ان کی مٹھی میں کچھ چپکے سے رکھ دیتی تو وہ سارے گھر کو دعا دیتیں گھر سے باہر آجاتیں۔مٹھی میں دبی رقم نے انھیں اس بار یاد دلایا کہ گوبھی کی فصل آگئی ہے اور انھوں نے ابھی تک اصلی گھی میں بکرے کے گوشت کے ساتھ تر تراتی ہوئی رسیلی گوبھی پکا کر نئے چاولوں کے ساتھ نہیں کھائی ہے۔

رات میں جب ہلکی ہلکی بارش ہورہی تھی تو وہ لالٹین کی مدھم روشنی میں لکڑی کے چولھے پر گوبھی گوشت پکا چکی تھیں۔ان کے ہاتھ کی پکائی ہوئی ہانڈیوں کی خوشبو جیسے ہی اٹھتی ناجانے کہاں سے وہ دیوار پر نمودار ہوجاتا۔اس رات بھی ہانڈی تیار ہوکر چولھے سے اتری ہی تھی کہ ہلکی ہلکی بوندا باندی میں وہ بھیگا بھاگا چوڑی دیوار پر آکر بیٹھ گیا اور اپنی سیاہ کھال کے پیچھے لال لال چمکتی آنکھوں سے چولھے کے پاس بیٹھی صغریٰ کو گھورنے لگا جو پلیٹ میں گوبھی گوشت نکال رہی تھیں۔

دیوار کی طرف دیکھے بغیر اور اس کی آہٹ کو سنے بغیر وہ بتا سکتی تھیں کہ وہ آچکا ہے۔وہ کہتی تھیں کہ اس کے دیوار پر آجانے پر ان کے نتھنوں میں ایسی بُو آنے لگتی تھی جو اکثر ان کے شوہر وصی کاظم کی بنیان سے آیا کرتی تھی۔عجیب بدہیئت سا بلاّ تھا وہ۔اس پر کالا رنگ اور سرخی مائل آنکھیں۔کلّا اور جبڑا بھی اس کا غیر معمولی تھا اور پیٹ اتنا بھاری کہ جیسے پیٹ میں بچہ ہو۔

بوندا باندی میں سارے بدن سے بھیگا وہ قدرے سکڑا ہوا صغریٰ بیگم کو تاکے جا رہا تھا۔
صغریٰ نے دھیرے سے پکارا تو وہ دیوار سے اتر کر ایک بار چھوٹے سے آنگن میں

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

رکا۔ پھر ادھر اُدھر دیکھ کر صغریٰ کے کمرے کی دہلیز پر آ کر بیٹھ گیا۔ صغریٰ نے ایک بوٹی کے ساتھ آدھی روٹی مل کر تام چینی کی ٹوٹی پلیٹ میں رکھ دی جو بلّے کے لیے مخصوص تھی۔ وہ اپنے کھانے میں یہ بھول گئیں کہ بلّا کھانا ختم کر کے دیوار پر جا چکا تھا۔ کسی کے رونے کی آواز پر وہ چونک پڑیں۔ دیکھا تو بلّا دیوار پر بیٹھا رو رہا تھا۔

وہ عاشور کی رات تھی۔ بلّے کی رقت بھری آواز پر انھیں وہ یوم عاشور یاد آ گیا جب ہندوستان آزاد ہونے میں کئی سال باقی تھے اور ریلوے اسٹیشن سے گزرنے والی فوجی گاڑیوں میں اوپر کے بدن سے ننگے گورے سپاہی بھرے رہا کرتے تھے۔ عاشور کی رات گھر کی دیوار پر کوئی بلّا ایسے ہی رویا تھا اور صغریٰ کے شوہر اس رات کی صبح اٹھنے والے علموں کی زیارت کرنے گئے تھے۔ اور ماتم کرتے ہوئے کربلا کو جانے والے ایک جلوس کے ساتھ ہو لیے تھے۔ جلوس لکھوریوں کے بنے قدیم مکانوں کی قطاروں کے تنگ راستے سے گزر رہا تھا۔ کہیں کہیں بوسیدہ مکانوں کے گرے ہوئے ملبے سے نالیوں کا پانی سڑک پر بہہ آیا تھا اس کو پھاندتے ہوئے جب وہ مدح صحابہ کمیٹی کے مرکز کے قریب پہنچے تو ایک مجمع سے ایک بوڑھا تہبند باندھے اور ہاتھ میں لاٹھی لیے ان کی طرف لپکا اور ان پر لاٹھی برسانے لگا۔

جلوس کے لوگ سینہ پیٹ پیٹ کر نوحہ پڑھ رہے تھے۔

حاکم شامی لعین است

پیش زینب نشین است

مدح صحابہ کمیٹی کو اس نوحے پر ہمیشہ سے تبرّے کی بُو آتی تھی، اور ان کے خیال میں شام کے حاکم کو لعین کہہ کر پکارنا مناسب نہ تھا۔ دوسری جانب، نوحہ پڑھنے والی انجمن کو ضد تھی کہ حضرت زینب کے سامنے بیٹھنے والا اور کوئی نہیں یزید تھا اور یزید لعین تھا۔

وصی میاں کی پٹائی بوڑھا اپنی لاٹھی سے شبنم کے دروازے کے سامنے کر رہا تھا پہلے تو وصی کاظم بوڑھے کی لاٹھیاں اپنی کسرتی باہوں پر روکتے رہے، آخر کو انھوں نے بوڑھے کی کمر میں گھس کر اس کو نالی کا پانی پلا دیا۔ اسی وقت شبنم نے پیچھے سے وصی کی شیروانی کا کالر پوری طاقت سے کھینچا اور انھیں دروازے کے اندر کر کے پھٹ سے دروازہ بند کر لیا اور زینے سے اوپر لے گئی۔

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

شبنم نے وصی کی شیروانی اتار کر کھونٹی پر ٹانگی، کرتے کی آستین ہٹا کر نیل دیکھے، گرم دودھ اور پھٹکری پلائی اور بولی:

''تم رافضی ہو، یہ تو میں جانتی تھی۔ مگر بانہوں پر لاٹھیاں روک کر ایک سُنّی سے اتنی مروت برتو گے، یہ مجھے امید نہ تھی۔ اگر بھیجا نکل آتا تو سڑک پر پڑے ہوتے۔'' پھر وہ کچھ سوچ کر بولی۔

''ہلدی چونا لگا دوں''؟

''نہیں۔'' وصی نے منع کر دیا۔

''ہاں تمھاری عورت پوچھے گی کہ چونا کس نے لگایا تو کیا جواب دو گے''۔

یوں تو جوانی میں شبنم کا وصی میاں کے ساتھ کیا کچھ نہیں ہوا مگر وصی میاں کے بیاہ میں آئی تو صغریٰ بیگم ہی آئی۔ صغریٰ کی ماں رنڈیوں کے گھروں میں حمل ساقط کرانے میں یا ولادتیں کرانے پر معمور تھی۔ وہی پیشہ صغریٰ نے بھی اختیار کیا تھا۔ جوانی میں صغریٰ دوہرے بدن کی سانولی سلونی مگر سفید دیدوں والی کھڑے ناک نقشے کی عورت تھی۔ صغریٰ کی چھٹی حس اپنے زمانے کے مرد کی ذہنی اور جسمانی جنسیت کو دور ہی دور سے اشاروں ہی اشاروں میں برانگیختہ کرنے کے فن سے کچھ اس طرح واقف تھی کہ اس نے شیر جیسے سیدزادے وصی میاں کو دو پل میں مار گرایا۔

صغریٰ سلیقے اور صفائی سے رہتی، نمازیں پڑھتی، درگاہوں میں شمعیں جلاتی، اور عاشور کے دن بال کھول کر اپنے تعزیے کے سامنے کربلا تک ننگے پیر پیدل چل کر سوز پڑھتی۔ شبنم اور وصی کاظم کا کیا رشتہ رہا تھا، یہ بات وصی کاظم نے سہاگ رات ہی کو صغریٰ سے مزے لے لے کر بتا دی تھی۔ اور جسم پر چاقوؤں کے وہ دو تین نشان بھی دکھا دیے تھے جو رقابت میں شبنم کو بچانے میں ان کے بدن پر لگے تھے۔ اپنی جان پر کھیل کر وصی نے شبنم کو نوچندی کے میلے کی بھیڑ بھاڑ میں بچایا تھا۔ اس واقعہ نے شبنم کو ہمیشہ کے لیے وصی کا مرید بنا دیا تھا۔

صغریٰ کو وصی کاظم نے پہلی بار اس کی ماں کے ساتھ شبنم ہی کے کوٹھے پر دیکھا تھا اور صغریٰ کے کٹاؤ دار کولھے میں سب کی نظر بچا کر ایسی باریک چٹکی لی تھی کہ صغریٰ سی سی کر کے رہ گئی تھی۔ صغریٰ نے بھی پھر گن گن کر اور چپکے چپکے وصی کاظم سے ایسے بدلے لیے

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

تھے کہ ان کی جان ہی تو نکل گئی تھی۔

صغریٰ جانتی تھی کہ اس کا میاں رنگیلا اور دل پھینک ہے۔ دن رات سائے کی طرح ساتھ لگی رہتی اور میاں کو الجھائے رکھنے کے ایسے ایسے جتن کرتی کہ رنڈیاں بھی عش عش کرتیں۔ لیکن وصی میاں کی مردانی شخصیت نے صغریٰ کو بہت شکی بنا دیا تھا۔ وہ ان کے اتارے ہوئے کپڑوں کو کئی کئی بار سونگھتی اور رومال کے دھبوں کو غور سے دیکھتی۔

وصی کاظم سیدزادہ تھا۔ اس کے باپ کو بھلا یہ کیسے پسند آتا کہ وہ ایک پیشہ ور دائی کی لڑکی کو اپنی بہو بنائے۔ اس نے اپنے بیٹے وصی کاظم کی زندگی اجیرن کر دی۔ وصی کو بھی غصہ آ گیا۔ اس نے پہلے تو باپ کو سمجھایا کہ صغریٰ دائی ہے، رنڈی نہیں ہے، جبکہ سیدزادوں کے کئی گھروں میں رنڈیاں ان کی ازواج کے طور پر پل رہی تھیں۔ جب وصی کاظم کا باپ اپنی ضد پر قائم رہا تو صغریٰ نے سنکھیا کھانے کی کوشش کی۔ مگر وصی کاظم نے اس کو بڑی دوڑ دھوپ کے بعد بچا لیا، اور اپنے باپ کا گھر یہ کہہ کر چھوڑ دیا کہ امام زمانہ کو زیارت میں یاد کر کے ختم ہو جانے والے محنت مشقت سے کمائی کرنے والی ایک دائی کو اپنے کنبے میں جگہ نہیں دے سکتے تو وہ امام غائب کے عالمی انقلاب کے تصور کو کیسے قبول کریں گے جس میں عدل وانصاف ہوگا، احساس محرومی ختم ہو جائیگا اور احساس کمتری نابود ہو جائیگا۔

وصی کاظم بہت دنوں تک پتھر توڑتا رہا، شام کو اس کی بنیان پسینے کی تیز بُو سے بھبھکنے لگتی جس کو صغریٰ بڑے چاؤ سے دھوتی۔ جب اس کام میں وصی کے دونوں ہاتھ جلد جلد زخمی ہونے لگے تو وہ ریلوے میں خلاصیوں کی نوکری پا گیا۔ وصی کاظم ہائی اسکول پاس تھا، لیکن باپ کو جلانے کے لیے اس نے چھانٹ چھانٹ کر ایسے کام کیے جو سیدزادوں کے لیے ہتک آمیز تھے۔ شادی وہ صغریٰ سے کر چکا تھا۔ اور صغریٰ سے بار بار یہ کہہ چکا تھا کہ یہ امام زمانہ کے عالمی انقلاب کی جانب اس کا پہلا قدم ہے۔

ریلوے میں خلاصی بننے سے پہلے اپنی بیوی کے ہاتھ پر اپنی کمائی رکھنے کی خاطر اس نے اپنے مسلک کے مردوں کو نہلانے کا کام شروع کر دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اکثر شیعہ خاندانوں میں مردے کو غسال ہی غسل دیا کرتے تھے۔ ایک بار وصی کاظم ایک نوجوان مردے کو نہلاتے ہوئے لگاتار اس عجیب وغریب شک میں مبتلا رہا کہ اس مردے میں جان

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

باقی ہے۔ کفن پہنا کر تابوت میں لٹاتے وقت تک بار بار اس کا جی اندر سے یہی کہتا رہا کہ مردے کا بدن لاش کی طرح ٹھنڈا نہیں، اور اسکے نتھنوں سے گرم ہوا کا نکلنا اور ہتھیلی پر محسوس ہونا اور اس کی آنکھوں میں روشنی کی چمک، سب کچھ زندہ انسان کی طرح ہے۔ بلکہ ایک بار تو وصی کو محسوس جیسے ہوا مردے کی بغلوں کو صاف کرتے وقت یکا یک مردے کو گدگدی سی محسوس ہوئی تھی اور ایک پل کو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔ جب مردے کو قبر میں اتار کر قبر پر لکڑی کے پٹرے رکھ دیے گئے اور اوپر سے مٹی ڈال دی گئی تو رات میں وصی کو بہت تیز بخار چڑھا اور دوسرے دن سے اس نے غسالی کا کام بند کر دیا۔

وصی کاظم کبھی کبھی صغریٰ سے کہتا تھا۔

''میں تمھیں اتنا پیار کرونگا کہ تم مجھ سے عاجز آجاؤ گی اور بھاگنے لگو گی۔ پھر تمھارا جی چاہے گا کہ کسی اور مرد کا ذائقہ چکھو۔ روز روز ارہر کی دال کھاتے کھاتے تنگ آجاؤ گی، پھر ایک دن ایسا آئیگا جب تم پچ میل دال پکاؤ گی''۔

وصی کی باتیں سن کر صغریٰ پہلے تو رو دیا کرتی تھی، پھر وہ ایسے فقروں اور باتوں کی عادی ہو گئی۔ وصی کچھ ہی روز ریلوے میں خلاصی رہا، اس کے بعد اسٹور کیپر ہو گیا۔ صغریٰ نے اپنے پیار کا پٹا اس کے گلے میں ایسا باندھا کہ اس کی سُدھ بُدھ ہی کھو گئی۔ وصی چالیس برس کا ہو کر جب مرا تو ہمیشہ صغریٰ کو یہی شک رہا کہ وہ مرا نہیں ہے کہیں روپوش ہو گیا ہے۔

یکبارگی بوڑھی صغریٰ کے کانوں میں بلّے کے رونے کی پھر آواز آئی۔

''دیکھیے، اگر حسینؑ کے غم میں رو رہے ہیں تو اور بات ہے۔ ورنہ رونا دھونا بند کر دیئے اور ادھر پلنگ پر آجایئے۔'' صغریٰ نے یہ بات بلّے کو مخاطب کر کے کہی۔

دو پل تو بلّا اپنے کو چاٹتا رہا پھر اتر کر آنگن میں آیا اور آنگن سے صغریٰ کے بستر پر۔ پہلے وہ سرہانے کی طرف گیا، سرہانے ایک کتاب رکھی تھی۔ بلّے نے کتاب کو توجہ کے ساتھ سونگھا پھر اپنے ایک پیر سے اس کو چھیڑنے لگا۔ کتاب کھل گئی۔ صغریٰ بہت غور سے بلّے کو ایسا کرتے دیکھتی رہیں، پھر کھلی ہوئی کتاب کو انھوں نے جلدی سے اٹھا لیا اور لالٹین کی لو گھبرا کر کانپتے ہاتھوں سے تیز کی۔ ہلکی روشنی میں اپنی بوڑھی آنکھیں انھوں نے اس صفحے پر گڑا دیں جو کھل گیا تھا۔ ان کے مشاہدے کے مطابق بلّا پہلے بھی اس کتاب کے ساتھ ایسا

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

سلوک کر چکا تھا۔ اور اس طرح کھل جانے والے صفحے کو صغریٰ نے ہمیشہ بہت غور سے پڑھا تھا، جیسے فال دیکھنے کے لیے دیوان حافظ کو لوگ کھولتے ہیں اور صفحے کے پہلے شعر کو پڑھ کر مطلب برآری کرتے ہیں

وہ کتاب حالاتِ امام زمانہ سے متعلق تھی اور جو صفحہ اتفاقاً کھل گیا اس کی تحریر یہ تھی:

خلاصہ یہ ہے کہ قائم آل محمد عجل
اللہ فرجہ ہدایت عالم کے لیے اس وقت ظاہر
ہونگے جب دنیا میں بے دینی پھیل جائیگی،
خواہش نفس کی پیروی ہوگی، عوام کو آلۂ کار
بنایا جائیگا۔ جماعتیں بکثرت ہونگی، عہد شکنی
عام ہوگی، دنیا کا حرص اس قدر بڑھ جائیگا کہ
عورتیں مردوں کے ساتھ مل کر تجارت کریں
گی۔ مسجدوں میں آرائش ہونے لگے گی،
وہاں لوگ صف بستہ ایک دوسرے کے قریب
ہونگے، ظاہری اجتماع ہوگا مگر باطنی افتراق
رہے گا۔ دل بھیڑیوں جیسے ہونگے۔ ۱۵ ماہ
رمضان کو سورج گہن، دمدار ستارے کا مشرق
سے طلوع، دیوار مسجد کوفہ کا انہدام، جانب
غرب سے ایک لشکر کا اٹھنا اور سمت شرق سے
اس کا مقابلہ، شرق سے عالم گیری فتنے کا بلند
ہونا مغرب کی جانب بڑی آگ کا بھڑکنا۔
پس ایسے خوفناک دور میں اور ایسی گمراہی کے
زمانے میں اس رہنما کا ظہور ہوگا۔ جو
سارے جہاں کے لیے ہدایت و رحمت ہے
تا کہ دنیا کو امن وامان کا پیغام پہنچائے۔

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

صغریٰ نے صفحہ ختم کیا، پھر کتاب بند کی اور لالٹین کی لو دھیمی کر کے بولیں:
''ہاں قرب قیامت ہے''۔ بلّے نے بستر پر اپنی پیٹھ اونچی کر کے بدن کو ایک خاص زاویہ دیکر اکڑایا، پھر جمائی لی۔

''اب پانی میں مت بھیگیے گا۔ لیٹ کر سو جائیے۔'' بلّا بستر پر پائنتی رکھی رضائی کے خول میں گھس گیا۔

صغریٰ چھوٹے سے کھٹولے پر بدن سکیڑ کر اور گڑ مڑی مار کر لیٹ تو گئی مگر پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیر تک پڑوس کے مکان والے کی لڑکی کی دیدہ دلیری پر عش عش کرتی رہی۔ دن دیہاڑے ماں باپ کی موجودگی میں اپنے یار کو بلا کر چوما چاٹی کرتی ہے چھنال۔ اور اماں ابا ہیں کہ نگر نگر دیدم دم نہ کشیدم۔

صغریٰ کو یکا یک اپنی جوانی کے وہ دن یاد آئے جب ملک میں بھگت سنگھ راج گرو اور سکھ دیو کو پھانسی دیے جانے کا ماتم منایا جا رہا تھا۔ انھیں دنوں جب صغریٰ نے اجمل سرائے کے پیچھے رہنے والے پتنگ ساز رئیس مرزا کی لڑکی کے بارے میں یہ سنا کہ چنی لال کنکوّا فروش کا لڑکا رات کے اندھیرے میں اپنی چھت سے جڑی ہوئی مرزا کی چھت پر پھاند کر آ جایا کرتا ہے تو صغریٰ کو یقین ہو گیا کہ کچھ ہی دنوں میں کوئی گل کھلنے والا ہے۔

صغریٰ کو اپنی ماں کے بیان کے مطابق یہ علم تو تھا ہی کہ رئیس مرزا کا خاندان آصف الدولہ کے بیٹے نواب وزیر آصف جاہ کے سلسلۂ نسب سے تھا۔ مرزا نے اس وقت بھی اپنی شرافت اور خاندانی عظمت کو نیچا نہ ہونے دیا۔ جب وہ مانجھے کی ڈور سوت سوت کر اور اپنی ہتھیلیاں لہولہان کر کے چنی ہوئی آستینوں والے برّاق اور بے داغ انگرکھے میں پوری جامہ زیبی کے ساتھ بازار سے نکلتے تھے اور کسی ایک فاقہ زدہ کو نان بائی کی دکان پر کھانا کھلاتے تھے۔

ایک رات انھیں دنوں صغریٰ کے دروازے پر کہاروں نے آواز لگائی۔ پتہ لگا رئیس مرزا کے گھر سے ڈولی بھیجی گئی ہے۔ صغریٰ کے گھر پر نہ جانے کتنے زبوں حال شریفوں کے گھروں سے چپکے چپکے ڈولیاں بھیجی جاتی تھیں اور جب ان شریفوں کی مصیبت دور ہو جایا کرتی تھی تو وہی شریف زادگان صغریٰ کو نیچ پیشہ سمجھ کر حقارت کی نظروں سے بھی دیکھتے

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

تھے۔ ایک بار تو صغریٰ کو اس قدر غصہ آیا کہ اس نے اپنے ہاتھوں کو سل پر رکھ کر بٹے سے کچل ڈالنا چاہا تا کہ راتوں میں اس کی خفیہ طلبی کا سلسلہ ہی ختم ہو جائے۔ وہ یہ بات سمجھ نہیں پائی تھی کہ جو لوگ اس کو اپنے برابر بیٹھنے کی جسارت پر تیوریاں چڑھا کر دیکھتے تھے وہ انھیں کی غلاظتوں کو زمانے سے چھپانے کے کام میں آخر کیوں لگی رہتی ہے۔

کہار تھے کہ دروازے سے ٹلنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ آخر کو صغریٰ بوجھل دل سے ڈولی میں بیٹھ گئی۔ رئیس مرزا کے دروازے پر جلتی لالٹین سے دور اندھیرے میں ڈولی روک گئی۔ اندھیرے میں ہی صغریٰ اتاری گئی اور تیزی سے صدر دروازے سے پلک جھپکتے میں اندر کر دی گئی۔ صغریٰ نے وہاں پہلے عشاء کی نماز پڑھی، پھر خدا سے دعا کی کہ گھر کی عورتوں کے شبہات غلط نکلیں۔ لڑکی نے دو روز سے کھانا پینا بند کر رکھا تھا۔ گورے چٹے اور روشن ماتھے پر نقاہت کا پسینہ چمک رہا تھا اور ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ روتے روتے آنکھوں کے پپوٹے سوج گئے تھے۔ صغریٰ نے گرم پانی، تولیہ، صابن اور سلفچی منگا کر اندر سے کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔

جب ہر طرح سے اطمینان کر لینے کے بعد وہ باہر آئیں تو لڑکی کی ماں سے انھوں نے صاف بتا دیا کہ بہت دیر ہو چکی ہے۔ چھیڑ چھاڑ کرنے میں جان کا خطرہ ہے۔ الٹے پیروں ڈولی سے واپس گھر آ کر صغریٰ نے رات گزاری اور فجر کی نماز ادا کر کے چوکی پر سے اٹھی بھی نہیں تھیں کہ کریم بہشتی کے چھوکرے نے آنگن میں مشک کے ساتھ گھستے ہی آواز لگائی کہ آدھی رات گئے رئیس مرزا نے اپنے آنگن کی قدیم باؤلی میں اپنی بیٹی کو ڈھکیل کر خود بھی چھلانگ لگا لی۔

بوڑھی صغریٰ نے بستر پر لیٹے لیٹے اپنے پیروں کی طرف ٹٹولا مگر ان کا بلا اب وہاں نہیں تھا، پیٹھ کے پیچھے دبکا پڑا تھا۔ انھوں نے کروٹ لی، بلے کے سر کو انگلیوں سے سہلانا شروع کر دیا۔ پھر وہ دھیرے سے بولیں:

''سنتے ہیں آپ؟'' بلے نے جواب میں آنکھیں بھی نہ کھولیں لیکن اس نے صغریٰ کو ایک سرد آہ کھینچتے سن لیا۔

''ہائے کیسے پر لگ جاتے ہیں دنوں کو۔ ۸۰ برس تو مجھے ہی ہو گئے ایک امام

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

غائب کے انتظار میں زندگی بسر کرتے ہوئے۔ یاد ہے آپ نے پالم پور کے مجتہد کو ایک برس گھر کی سالانہ مجلس پڑھنے کے لیے بلایا تھا۔ ممبر پر بیٹھ کر انھوں نے ہی تو کہا تھا کہ وہ لوگ جو اپنے کو حضرت امام زمانہؑ کا منتظر کہتے ہیں ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے کو ایک بڑی تبدیلی کے لیے آمادہ کریں، اپنا خود امتحان لیں اور اپنی سوچ کو حق کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھیں۔ بولیئے میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نہ۔" بلّے کو صغریٰ نے ایک ہاتھ سے جھنجوڑ کر پوچھا۔

بلّے نے اپنا پورا بدن ایک بار تان دیا، منہ کھول کر جمائی لی اور ادھ کھلی آنکھوں سے صغریٰ کو دیکھا۔

"آپ تو گواہ ہو کہ میں اپنے بیٹے کے گھر سے کیوں نکلی تھی۔؟" صغریٰ نے کچھ ایسے اعتماد سے سوال کیا جیسے بلّا نہیں ان کے شوہر وصی کاظم ان کے پاس بیٹھے ہوں۔

صغریٰ کو بہو کے گھر کے امام باڑے کی وہ رات یاد آئی جب ان کی بہو نے شام کو گھر کے ایک کمرے میں سجائے گئے امام باڑے کا دروازہ کھولا تھا اور موم بتیاں جلا کر اگر بتیاں سلگا کر اور ہاتھ پھیلا پھیلا کر یہ دعا مانگی تھی: "یا مولا آپ گھروں گھروں اپنے معجزے دکھا رہے ہیں بس ایک بار میرے امام باڑے میں بھی معجزہ دکھا دیجیئے"۔

صغریٰ کو اپنی بہو کی یہ مراد کچھ عجیب سی لگی اس زمانے میں آئے دن گھروں کے عزاخانوں میں مولا کے معجزے ہو رہے تھے۔ کبھی خبر آتی کہ جعفری وکیل کے عزاخانے میں امام حسینؑ کے علم سے خون کی دھار بہی، کبھی عورتیں خبر لاتیں کہ بینک منیجر نقوی صاحب کے امام باڑے میں آقا مولا کے علم سے سنہری شعاعیں پھوٹتی ہیں۔ صغریٰ یہ خبریں سنتیں، عورتوں کو جوق در جوق ایسے امام باڑوں میں دھکا مکی کر کے گھستے ہوئے دیکھتیں اور سانس روکے کچھ بھی کہنے کی ہمت نہ کر پاتیں۔ دوسروں کے بارے میں تو وہ کچھ نہ کہہ سکیں، لیکن جس دن مہندی کا جلوس تھا اس شام انھوں نے اپنی بہو کو شبیہ کربلا حضرت قاسم کے تابوت پر استادہ علم کو مہندی سے لیتے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا اور بعد میں سینہ پیٹ کر پکارتے بھی سنا "ہائے علم پر مہندی کہاں سے آئی" پلک جھپکتے میں مشہور ہو گیا کہ وصی کاظم کے گھر پہ مولا کا معجزہ ہوا ہے۔ صغریٰ کس سے کہتیں اور کیسے کہتیں کہ کبھی نماز روزہ بھی نہ کرنے والی عورت اور ہر دم اپنا لباس، اپنے کھانے، اپنے جسم اور اپنی پسند کی خواہش کو کسی بھی طرح پورا کرتے

Scanned by CamScanner

رہنے کے جتن میں لگی رہنے والی ان کی بہو کتنی بڑی جھوٹی فریبی اور مکار ہے۔

بہت برس پہلے جب ان کا بیٹا بارہ یا چودہ برس کا رہا ہوگا اور ملک میں تقسیم کے بعد فسادات پھوٹ پڑے تھے اور سر پر عمامہ باندھے اور کالی عبا پہنے بڑے بڑے مجتہدوں کے خاندان ریلوے پلیٹ فارم پر پڑے پڑے پاکستان جانے والی گاڑیوں کا انتظار کیا کرتے تھے، صغریٰ نے ایک مولانا کو اسٹیشن لے جانے اور انھیں گاڑی میں بٹھانے کی خدمت انجام دینے کے لیے اپنے بیٹے رضی کاظم کو بھیجا تھا۔ مولانا کو پلیٹ فارم پر جب بھوک لگی اور کھانے کا سامان فروخت کرنے والا ایک بھی مسلمان وہاں نظر نہ آیا تو مولانا نے رضی کاظم کو اسٹیشن کے باہر بھیج کر مسلمان حلوائی سے جلیبیاں منگوائیں۔

رضی کاظم باہر نکل کر بہت بھاگے دوڑے مگر انھیں آس پاس کسی بھی مسلمان حلوائی کی دکان نظر نہ آئی۔ آخر کو انھوں نے ہندو حلوائی سے جلیبی خریدی اور مولانا سے جھوٹ بولا کہ مسلمان حلوائی کی دوکان سے لایا ہے۔ مولانا نے جلیبی کا ناشتہ کیا۔ دو چار جلیبیاں پڑیا میں راستے کے لیے رکھ لیں اور رضی کاظم کے پوچھنے پر کہ وہ کون سی کتاب لگاتار بڑے شوق سے پڑھے جا رہے ہیں، انھوں نے بتایا کہ وہ تاریخ کی کتاب ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے پردادا کو اودھ کے بادشاہ امجد علی شاہ نے سلطان العلما، مجتہد العصر کا خطاب پیش کیا تھا اور سلطان العلماء نے برطانوی اقتدار کے اثر میں آنے والے شعبوں کو چھوڑ کر باقی تمام شعبوں کو اسلامی قوانین کے مطابق ہی چلایا تھا۔

رضی کاظم نے مولانا کو ٹرین میں بٹھا کر اور گھر آ کر اپنی ماں صغریٰ کو بتا دیا کہ اگر میں ہندو حلوائی کی جلیبی کو مسلمان حلوائی کی جلیبی بتا کر نہ کھلا دیتا تو مولانا بھوکے بغیر ناشتے کے سفر کرتے۔ کئی برس بعد صغریٰ کو خبر ملی کے پاکستان میں مسلمانوں نے شیعہ سنی جھگڑے میں انھیں ذبح کر دیا لیکن انھیں کھانا پہلے کھلا کر خالی پیٹ کسی کی جان لینے کے گناہ سے خود کو صاف بچا لیا۔

صغریٰ پر قیامت اس روز گزری جب ان کی بہو نے صغریٰ کی بیماری کے دنوں میں کئی بار ان کے پیشاب کے بستر کو دھونے کے بعد ان کے بیٹے سے چار چوٹ کی لڑائی لڑی تھی اور اپنے شوہر سے صاف اعلان کر دیا تھا کہ میں تمھاری والدہ کی خدمت کی ایک

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

یل کو بھی ذمہ داری لینے کو تیار نہیں ہوں ۔رضی کاظم کی بیوی مہینے میں دو بارہ ہوٹلوں میں کئی پارٹیوں میں جایا کرتی تھی۔ وہ گھر سے باہر کبھی میاں کے ساتھ تو کبھی اکیلی کھانا کھاتی تھی اور گھر پر کھانا پکانے والی کے ناغہ کرنے پر دومنٹ میں تیار ہو جانے والی پیکٹ کی بند غذاؤں کو اُبال کر کھا لینے کی رسم پوری کر لیا کرتی تھی ۔صغریٰ کو اس غذا کو دیکھ کر ہی کراہت آتی تھی ، وہ ان کو ابلے ہوئے کیچوے سمجھ کر دیر تک اُبکائیاں لیتی رہتیں ۔

صغریٰ کو جب معلوم ہوا کہ رضی کاظم ان کی بہو کی گرفت میں جکڑ گیا ہے اور ان کے مثانے کی کمزوری کا علاج نہ تو حکیموں کے پاس ہے اور نہ ڈاکٹروں کے پاس اور اگر علاج ہے بھی تو اس پر روپیہ خرچ کرنے کے لیے بہو کے ڈر سے بیٹا آمادہ نظر نہیں آتا ، اور گھر میں اکثر دیر رات تک صغریٰ بھائیں بھائیں کرتی ویرانی میں اکیلی پڑی رہتیں تو انھوں نے نالے کے اوپر بنے ہوئے اس کچے مکان کی کوٹھری میں رہنا پسند کیا جس میں پڑوس کا گھوسی چارے پانی کے لیے اپنی بھینسیں باندھا کرتا تھا۔

وہ محرم کی آٹھ تاریخ تھی جب انھوں نے بیٹے کا گھر چھوڑ کر اس مویشی خانے کی کوٹھری میں پناہ لی تھی ۔

اس روز کی مردانی مجلس میں ان کے بیٹے رضی کاظم نے اپنے باپ کی طرح پالم پور کے مولانا کو بلایا تھا۔صغریٰ چپکے چپکے ایک پوٹلی میں اپنی ضرورت کی چیزیں سمیٹ رہی تھیں اور مردانے میں ممبر پر حدیث خوان مجلس پڑھتے ہوئے کہہ رہا تھا:

> مومنین ، ایک روایت کے مطابق حضرت امام
> جعفر کا فرمانا ہے کہ جس وقت تم یہ دیکھو کہ
> دین خدا اپنے مفاہیم سے اس طرح خالی
> ہو گیا ہے جس طرح برتن الٹ دیا گیا ہو ، جس
> وقت تم یہ دیکھو کہ مرد مرد پر اور عورتیں عورتوں
> پر اکتفا کر رہی ہیں ، جس وقت تم یہ دیکھو کہ
> رشتے ناتے ٹوٹ چکے ہیں ، جس وقت تم یہ
> دیکھو کہ لوگوں کی ساری توجہ پیٹ اور شرم گاہ

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

پر مرکوز ہے ایسے زمانے میں اپنے آپ کی
حفاظت کرو، خدا سے نجات طلب کرو کہ
تمھیں مفاسد سے محفوظ رکھے۔

ابھی روایت بیان کرنے والا ذاکر ممبر سے اتر بھی نہ پایا تھا کہ صغریٰ اپنی اولاد کا گھر چھوڑ کر اور ایک پوٹلی بغل میں دبا کر اور برقعہ اوڑھ کر لکڑی ٹیکتی کلکتہ جوتیاں سٹاتی مویشی خانے کی ایک کوٹھری میں آکر آباد ہوگئیں تا کہ آئے دن کے فسادوں سے دور رہ سکیں۔

بیٹے کے گھر میں اگر کسی کے چھوٹنے کا انھیں غم تھا تو وہ ان کی پوتی سکینہ تھی۔ سکینہ کو رضی نے بڑے لاڑ پیار سے پالا تھا۔ تب کمپیوٹر کا چلن شروع بھی نہ ہو پایا تھا کہ باپ نے سکینہ کو ایم کام کے ساتھ کمپیوٹر کا ایڈوانس کورس بھی کرادیا تھا۔ صغریٰ نے خاص طور پر بچپن میں سکینہ کو دینی تعلیم دلوائی تھی۔ زنانی مجلسوں میں سکینہ بڑے اعتماد سے حدیث خوانی کرنے لگی تھی۔ نئی جوانی، قبول صورت، کندنی رنگ، بھرا ابھرا پرکشش سینہ، قد بھی نکلتا ہوا۔ شمالی ہند کے کسی ہندو لڑکے نے جو انجینیر نگ کی تعلیم کی غرض سے مقیم تھا اس پر ڈورے ڈالے۔ گھر میں خبر پہنچی، باپ ماں نے سختیاں کیں۔ پہلے تو سکینہ نے انھیں سمجھایا کہ بہت کوشش کے بعد بھی اپنے لیے وہ کوئی معقول روزگار والا باصلاحیت مسلمان لڑکا نہیں تلاش کر پائی ہے، وہ اس لڑکے کی دوستی کو ذریعہ بنا کر باہر جانا چاہتی ہے۔ جہاں اسے امید ہے کہ وہ کامیاب ہو سکے گی، مگر اس کا کوئی عذر قبول نہیں کیا گیا۔

اب کبھی کبھی سکینہ دو دو تین تین دن کچھ کھائے پیئے بغیر گھر کے کسی بھی کمرے کے ایک کونے میں کھڑی رہتی اور دماغی علاج کرنے والے ڈاکٹر کے سوالوں کے جواب میں اسے یقین دلانے کی کوشش کرتی ہے کہ بھوک پیاس نہ لگنے اور بیٹھنے یا لیٹنے کو جی نہ چاہنے کے یہ معنی نہیں ہو سکتے کہ وہ پاگل ہے۔

ایک دن صغریٰ کو سکینہ کی بہت یاد آئی۔ وہ دل پر جبر کر کے بیٹے کے گھر گئیں۔ مگر جب ان کی بہو نے جدھر جدھر وہ جاتیں ادھر ادھر ان کے پیچھے لگ کر ان کی اس طرح نگرانی کرنا شروع کردی جیسے وہ گھر سے کچھ اٹھا نہ لے جائیں، تو اسکے بعد سے صغریٰ نے اس گھر میں قدم رکھنا بند کر دیا اور وہ رقم جو کبھی کبھی ان کا بیٹا انھیں بیوی سے چھپا کر دے دیا کرتا

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

تھا، اسے بھی لینے سے انکار کر دیا۔

وہ آوارہ سایہ بدہیت سا کالا بھجنگ بلّا جس کے گلے میں اب موتیوں کا پٹہ پڑا رہتا ہے صغریٰ کو اس مویشی خانے میں آنے کے بعد ملا تھا۔ کبھی کبھی بلیاں اس کو تلاش کرتی ہوئی دیوار پر خوب لڑتیں۔ خدا جانے کن آوارہ بلوں نے اس کو چیر پھاڑ کر خونم خون کر ڈالا تھا۔ وہ دیوار پر بیٹھا روتا رہا اور اپنے زخم چاٹتا رہا۔ اس کی آواز بار بار کوٹھری میں لیٹی ہوئی صغریٰ کے کانوں سے ٹکرا رہی تھی، ایک بار انھیں ایسا لگا کہ ان کے مرحوم شوہر وصی کاظم شیعہ سنی کی لڑائی میں اپنے بازوؤں پر لاٹھیوں کی بند چوٹوں کے درد سے جس طرح کراہا کرتے تھے یہ بلا بھی ویسے ہی کراہ رہا ہے۔ بلّے نے انھیں گھورتے ہوئے پھر ویسے ہی کراہنے کی آواز نکالی۔

صغریٰ دل پر ہاتھ رکھ کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے بلّے کو دیکھتی رہیں۔ کچھ دیر بعد وہ زخمی بلا دیوار سے نیچے اترا اور دم اوپر اٹھا کر ان کے پیروں کے گٹوں پر اپنا بدن رگڑنے لگا۔ یکایک ان کے نتھنوں میں ایسی بو محسوس ہوئی جیسی وصی کاظم کے پسینے میں ڈوبی بنیان سے آیا کرتی تھی۔ صغریٰ کا دل دھڑ دھڑ کرنے لگا۔ پہلے بھی وہ اس بلے کی موجودگی میں وصی کے پسینے کی بو محسوس کر چکی تھیں۔ وہ گھبرا کر کوٹھری کی جانب پلٹیں، جلدی سے اندر گھس گئیں اور پلٹ کر بڑے استعجاب کے ساتھ بلّے کو دیکھنے لگیں۔ بلا نڈھال سا چلتا ہوا کوٹھری کی دہلیز کے آگے بیٹھ گیا۔ صغریٰ نے دیکھا اس کے بدن پر کئی جگہ گہرے زخم تھے، کھال ادھڑ گئی تھی اور جگہ جگہ سے خون رس رہا تھا۔ صغریٰ غصے سے لال ہو گئیں۔ بولیں:

"اب آپ کی وہ عمر نہیں ہے کہ بازاروبلّیوں کے چکر میں آوارہ بلّوں سے اپنا بدن نچوائیں۔"

انھیں یاد آ گیا تھا کہ وصی کاظم نے انھیں کون سی کہانی بتا کر چاقوؤں کے وہ زخم دکھائے تھے جو انھوں نے شبنم سے عشق بازی کے چکر میں نوچندی کے میلے میں کھائے تھے۔ صغریٰ نے ناراضگی کی حالت میں تام چینی کی ٹوٹی پلیٹ میں ذرا سا دودھ ڈالا اور بلّے کے آگے رکھ دیا۔ مگر بلّے نے اس کو سونگھ کر چھوڑ دیا۔ وہ اپنے زخموں کی تکلیف سے کانپ رہا تھا۔ صبح جب صغریٰ بیدار ہوئیں تو پلیٹ سے دودھ غائب تھا اور بستر سے بلّا۔

صغریٰ کے شوہر وصی کاظم اکثر حضرت امام مہدیؑ کے حالات زندگی پر مبنی ایک

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

کتاب سے فال دیکھا کرتے تھے یا نصیحت لینے کا کام کرتے تھے۔ صغریٰ کو بھی انھوں نے اس کا قائل کر دیا تھا۔ ایک دن ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب ان کے بلّے نے کتاب کو پنجوں سے الٹ پلٹ کر ایک صفحہ کھول دیا اور بار بار اس صفحے کو سونگھ کر اور صغریٰ کو دیکھ کر میاؤں میاؤں کرنے لگا۔ صغریٰ نے پڑھا تو اس صفحے پر لکھا تھا:

"علامہ ملا باقر مجلسیؒ نے بحار الانوار میں اہل نجف کی ایک جماعت کے بیان کئے ہوئے واقعے کا ذکر یوں کیا ہے کہ کاشان کا رہنے والا ایک شخص حج بیت اللہ کے خیال سے نجف آیا اور ایسا بیمار ہوا کہ پاؤں خشک ہو گئے اور وہ حج کو نہ جا سکا۔ ایک دن کاشان کا وہ شہری دوسروں کی مدد سے نجف سے باہر اس مقام پر پہنچایا گیا جو حضرت حجتؑ (امام مہدیؑ) کہلاتا ہے۔ بیمار نے وہاں کا واقعہ بتایا، کہ ناگاہ ایک خوش رو جوان تشریف لائے، مجھے سلام کیا اور حجرے کے اندر چلے گئے۔ وہاں نماز پڑھ کر وہ میرے پاس آئے اور میرا حال دریافت کیا۔ میں نے کہا کہ سخت بلا میں مبتلا ہوں۔ نہ تو بیماری رفع ہوتی ہے کہ تندرست ہو جاؤں اور نہ موت آتی ہے کہ راحت مل جائے۔ انھوں نے کہا غم نہ کرو خداوند عالم دونوں چیزیں عطا فرمائے گا۔ وہ تو چلے گئے۔ اسی اثنا میں ایک کپڑا دھو کر پیڑ پر پھیلایا تھا وہ زمین پر گر گیا۔ میں نے جا کر اسے اٹھایا، دھویا، اور پھر پھیلا دیا۔ بعد میں

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

مجھے احساس ہوا کہ کہاں تو میں ایک قدم بھی
چل نہ سکتا تھا اور کہاں میں نے چل پھر
کرا تنے کام کرڈالے۔ یہ واقعہ میں نے
اپنے رفیق کو جب بتایا تو وہ افسوس کرتا رہا کہ
امام آخر کی زیارت اس کو نصیب نہ ہوئی۔''

صغریٰ نے اس مضمون کو بڑے غور سے دوبارہ پڑھا۔ اب بلّا جیسے پرسکون ہوگیا تھا وہ بستر کے پائیتی دبکا بیٹھا ہوا تھا۔ عبارت پڑھ کر صغریٰ نے فوراً وضو کیا، نماز ادا کی اور زیارت پڑھ کر سجدے میں گر گئیں اور ہچکیوں سے رورو کر دعا مانگتی رہیں۔

''یا حضرت میری بھی فریاد سن لیجئے۔ بستر پر پیشاب کی کھراہند اب اس قدر بڑھ گئی ہے کہ کوئی اس کے پاس کھڑا نہیں ہوسکتا۔ آپ کو مولا مشکل کشا کا واسطہ مجھے اس مرض سے نجات دلائیے۔''

اس نماز اور دعا کے بعد صغریٰ کا گھڑی گھڑی پیشاب جانا اور پیشاب کی بوندوں کا بستر اور کپڑوں کو ناپاک کرنا تقریباً بند ہوگیا۔

اس واقعے کے بعد سے صغریٰ گھنٹوں اس بلّے کو ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہتیں۔ انھوں نے جھوٹے موتیوں کو کپڑے پر ٹانک کر بلّے کے لئے ایک خوبصورت سا پٹہ بنا کر اس کی گردن میں باندھا۔ آیئے، بیٹھئے، کھایئے، جایئے جیسے الفاظ اس کے لئے استعمال کرنے لگیں۔ سڑک پر جب وہ چلتیں تو بلّا اکثر پیچھے پیچھے چلتا، آوارہ کتے دوڑتے تو وہ بنگلوں کی باہری دیواروں پر چڑھ جاتا۔ کچھ دنوں میں وہ اپنی بستی میں ''بلّے والی صغریٰ'' مشہور ہوگئیں۔

اب صغریٰ میں گھر گھر جا کر صدقہ خیرات کی رقوم حاصل کرنے کی سکت نہیں رہ گئی ہے۔ وہ شاہ مینا کے مزار کے قریب ایک میلی سی چادر زمین پر بچھا کر بیٹھ جاتی ہیں اور بھیک مانگ کر آدھا چوتھائی پیٹ پالتی ہیں۔ ان کا بیٹا رضی کاظم فالج سے بستر پکڑ چکا ہے اور بہو عیاش پولیس افسروں کے لئے چکن کا کام کرنے کی آڑ میں جسم فروشی کرنے والی کنواریوں کی دلالی کا کام کر کے فیشن بھری زندگی گذار رہی ہے۔

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

اس دن صغریٰ پر پہلا دل کا دورہ پڑا تھا جب شہر میں یکا یک پھوٹ پڑنے والے فساد کے موقعے پر ان کی بہو دو روز گھر سے غائب رہی تھی اور تیسرے روز شہر کے باہر کے علاقے میں ایک کولڈ اسٹوریج کی عمارت کے پاس اس کی کٹی پٹی لاش ملی تھی۔ اب صغریٰ کو ایک بار پھر ایسا لگتا ہے کہ ان کے کپڑوں پر پیشاب کی بوندیں جلدی جلدی ٹپک جاتی ہیں اور وہ ناپاک ہو جاتی ہے۔ انھوں نے اب نماز پڑھنا بند کر دیا ہے۔ ان کا بلّا اپنے گلے سے موتیوں کا پٹا نوچ کھسوٹ کر پھینک چکا ہے اور وہ بلّے بلیوں کی لڑائی میں جلد جلد زخمی ہونے لگا ہے۔ صغریٰ اس کے زخموں کو دیکھ کر اس کو دل ہلا دینے والے کوسنے دے کر جی ہلکا کرنے کی کوشش کرتی ہیں لیکن انھیں پھر بھی چین نہیں ملتا ہے۔

بلّے نے اب ان کے پیچھے پیچھے چلنا بند کر دیا ہے اور مویشی خانے کی چھت کے موکھوں میں آتے جاتے کبوتروں کی تاک میں لگا رہتا ہے۔ صغریٰ کے بڑھاپے اور بیماریوں نے انھیں توڑ دیا ہے۔ اکثر گھر کا چولھا بھی نہیں جلتا، ان کی پڑوسن خدا ترسی میں کبھی کبھی کچھ کھانے کو دے جاتی ہے۔ ان کی مصیبتیں بڑھ رہی ہیں اور صبر کا دامن چھوٹ رہا ہے۔ ایک دن بھیگی آنکھوں سے وہ بلّے کو اپنی گود میں بٹھا کر کہتی ہیں:

''آیئے اب یہاں سے چلیں، خدا جانے ان کا ظہور کب ہوگا۔ میں ایک نیا بلیڈ خرید لائی ہوں۔''

صغریٰ کو اب یقین ہو چلا ہے کہ انتظار کی اس منزل سے انھیں محروم رہنا ہے جو منزل منتظر کو شہادت کے اعلیٰ درجے تک پہنچاتی ہے۔ ایک بار وصی کاظم نے ان سے کہا تھا کہ جب بھی تمھیں شک ہو کہ میں تمھارے لیے مخلص نہیں رہ گیا ہوں تو مجھے کسی بورے کے اندر بند کر کے اور بورے کو فرش پر پٹک پٹک کر مجھے ختم کر دینا کیونکہ میں بڑا سخت جان ہوں آسانی سے نہیں مروں گا۔

ایک دن صغریٰ ایک پرانی بوری کا منہ کھولتی ہیں، بلّے کو اس کے اندر داخل ہونے کا حکم دیتی ہیں، پھر تسلی سے بوری کا منہ اچھی طرح سے باندھ دیتی ہیں۔ بوری کو باندھنے کے بعد وہ بوری اٹھا کر بھینسوں کو چارہ کھلانے کے لئے بنائے ہوئے پکے تھالوں کے پاس خود کو گھسیٹتی ہوئی لے جاتی ہیں اور اونچے پکے چبوترے پر بنے ان تھالوں کی کگار پر بوری کو

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

اس طرح پیٹنا شروع کرتی ہیں جیسے دھوبی کپڑے پیٹتا ہے۔

بوری کے اندر ان کا بلا ہر ضرب پر تڑپتا ہے، غراتا ہے، مگر صغریٰ بوری پیٹتی جاتی ہیں۔ ان کے بازوؤں میں غیر معمولی طاقت بڑھتی جاتی ہے اور بڑی بڑی سفید آنکھوں میں سرخی پھیل جاتی ہے۔ بند بوری میں چوٹیں کھا کر بلے کی غرّاہٹیں بڑھتی جاتی ہیں لیکن صغریٰ کا ہاتھ نہیں رکتا۔ تھالوں کے دھاردار کناروں پر بوری کو پیٹنے سے کوئی کوئی ضرب ایسی لگتی ہے کہ بلا بلبلا کر چیخ پڑتا ہے۔ بہت دیر تک صغریٰ بند بلّے کو پٹخیاں دینے کا کام جاری رکھتی ہیں۔ ان کی سانسیں دھونکنی کی طرح چلنے لگتی ہیں۔ انھیں بوری پر جگہ جگہ خون کے دھبے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ چبوترے پر دو پل ستانے کو بیٹھ جاتی ہیں اکھڑی سانسوں کے ساتھ اپنا منہ بوری کے پاس لے جاتی ہیں اور کہتی ہیں:

''ہم دونوں کی قسمت میں آسان موت نہیں ہے۔ تم مر جاؤ پھر میں اپنی کلائیوں کی نسیں کاٹ کر لیٹ جاؤنگی۔ اور قطرہ قطرہ کر کے مروں گی۔''

صغریٰ ستانے کے بعد پھر پکی کگار پر بوری کو دھننا شروع کرتی ہیں۔ آخر کو بوری کے اندر اچھل کود بند ہو جاتی ہے۔

صغریٰ کو نہیں معلوم تھا کہ سب کچھ ان کا چاہا جیسا نہیں ہوگا، کیونکہ جب وہ نیا بلیڈ نکال کر اس کو اپنی کلائی پر چلانے کو ہوتی ہیں تو ان کے سینے میں تیز درد اٹھتا ہے۔ وہ بستر پر بیٹھے بیٹھے بستر پر ہی گر پڑتی ہیں۔ تھوڑی دیر بعد ان کے منہ سے جھاگ چھوٹتا ہے اور وہ نیلی پڑ جاتی ہیں۔ اسی وقت ایک پل کو بند بوری میں خفیف سی حرکت ہو کر بند ہو جاتی ہے۔

۲۰۰۲ء

□□□

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

سوختہ ساماں

آتش دوزخ میں یہ گرمی کہاں
سوزِ غم ہائے نہانی اور ہے

(غالبؔ)

یہ سلسلہ ایک دوپہر کو شروع ہوا۔

گلابی جاڑے تھے، دھوپ بھلی لگتی تھی، شام کو ہوا خنک ہو جاتی تھی۔ گھومنے پھرنے اور ملنے ملانے کے دن تھے۔ ایکا ایک کچھ ایسا ہوا کہ موسم کے لطف کا احساس ختم ہونے لگا۔ جانے کہاں سے ہلکی سی خاموشی اٹھی اور بھاری ہوتی چلی گئی۔ زبان سے تو کوئی کچھ نہ کہتا تھا یا ممکن ہے کہ کہنا چاہ نہیں رہا تھا مگر آنکھوں پر کسی کے قابو نہ تھا۔ آنکھیں کچھ کہہ رہی تھیں، کچھ ایسا کہہ رہی تھیں جنھیں دیکھنے والے سمجھ رہے تھے۔ ممکن ہے پوری طرح نہ سمجھ رہے ہوں مگر اُتنا ضرور ہی سمجھ رہے تھے جتنا آس پاس کی آنکھیں سمجھا رہی تھیں۔

کہتے ہیں سناٹا ایک عجیب سی پُر اسرار زبان بولتا ہے، اسکا اصل سبب تو نہیں پتا شائد اسکی زبان میں اس لئے طاقت ہوتی ہو کہ دوسروں کو چُپ کرا کے اکیلے بولتا ہے بہرحال سناٹا پورے دن ایک ایسی زبان بولتا رہا تھا جس کا اپنی اپنی زبان میں لوگ خاموشی سے ترجمہ کر کے اپنی اپنی جگہ پر مفہوم سمجھتے رہے۔ پھر شام آئی، شام جیسی بھی تھی شام تھی کیونکہ دن سے چھٹکارا دلا رہی تھی اور رات میں بدلنے والی تھی اور کیسی بھی رات ہو جب دن بھر کے سناٹے کے بعد آتی ہے تو غیر معمولی ہو جانے سے اسے روکنا شائد بے حاصل سی کوشش ہوتی ہے۔ رات آئی تو جیسے کچھ پڑوسی اسکا انتظار ہی کر رہے تھے۔

اس کے گھر کی کسی نے کنڈی کھٹکھٹائی۔ اس نے کھٹکھٹاہٹ سنی، پھر دروازے کے ایک بار پھر کھٹکھٹائے جانے کا انتظار کیا، دوسری بار پھر وہی آواز آئی، ویسی ہی جیسی اکثر آتی تھی۔ دراصل وہ کانوں پر زور دیکر دستک کو اس طرح پہچاننا چاہ رہا تھا جیسے بینک کا بابو چیک پر کی گئی دستخط رکارڈ میں محفوظ دستخط کے نمونے کو سامنے رکھ کر پہچانتا ہے۔ دل نے شناخت

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

کی تصدیق کی، اگر نہ بھی کرتا تو بھی سناٹے نے ابھی ایسا کچھ نہ کہا تھا کہ دروازہ کھولنے میں پس وپیش کی جاتی۔ دروازہ کھلا تو سامنے توقع کے مطابق جانے پہچانے پڑوسی کا چہرہ تھا، حسب معمول وہ دروازے سے ہٹا اور حسب معمول پڑوسی اندر آکر اسی کرسی پر اسی انداز سے بیٹھ گیا جیسے اکثر بیٹھا کرتا تھا۔ اس نے کوئی بات نہ کی ذرا دیر بعد دروازہ کھسکا کر دوسرے پڑوسی نے اندر جھانکا اور صاحب خانہ کو کمرے میں موجود پا کر وہ بھی آکر بیٹھ گیا، اسی جگہ اور اسی انداز سے جیسے وہ اکثر بیٹھا کرتا تھا۔

دن بھر مسلسل سرگرم رہنے کے بعد اب سناٹا جیسے تھکنے سا لگا تھا۔ وہ اب کچھ دم لینا چاہتا تھا اس لئے چاہ رہا تھا کہ اب لوگ کچھ بولیں لوگوں کا بھی صبر اب اپنی اپنی جگہ کچھ ٹوٹ سا رہا تھا اس لئے کمرے میں پہلی آواز جو اٹھی وہ سب سے پہلے آنے والے پڑوسی کے کھکھارنے کی تھی۔ صاحب خانہ کو جیسے بس اتنی ہی سی آواز نے بھر دیا۔ انہیں وہ کھکھار اسلئے بھی غالباً اچھی لگی کہ اسکے ساتھ ایک اُمید بھی بندھی تھی۔ آگے کچھ ایسا ہونے کی امید جو دن بھر نہ ہوا تھا، شائد وہ لفظوں کی امید تھی، وہ لفظ جو سارا دن بغیر بتائے کہیں چھپ گئے تھے۔ صاحب خانہ نظر بچا کر بار بار کھکھارنے والے کو دیکھ رہا تھا کہ اب کوئی فقرہ ادا ہوگا، ایک پورا با معنی فقرہ۔ امید غلط نہ تھی آواز اٹھی، پورا دن کھوئے رہنے کے بعد یکا یک ابھرنے والی آواز کیسی لگتی ہے اس کا ایک عجیب سا تجربہ صاحب خانہ کو اس دن ہوا۔ پورا فقرہ تو نہیں ہاں پہلے آدھا فقرہ ادا کیا گیا۔

''ہماری رائے میں تو''

بولنے والے کی آواز کیونکہ دن بھر کے بعد نکلی تھی اس لئے آدھے فقرے پر ہی لڑکھڑا گئی۔ جیسے کوئی بچہ پہلی بار چلنے کی کوشش میں لڑکھڑا جایا کرتا ہے۔ صاحب خانہ نے اسے ہمت بندھانے والی نگاہ سے دیکھا تو ایک بار پھر کھکھارنے کے بعد فقرہ پورا ہوا۔

''ہماری رائے میں تو حالات ٹھیک نہیں ہیں۔۔'' یہ کہہ کر اس نے بعد میں آنے والے پڑوسی کی جانب دیکھا، بعد والے نے جواب میں خفیف سی گردن ہلائی، غالباً وہ دونوں اب اس درجے پر تھے جس مقام پر ضعیف کسان بادلوں کو دیکھ کر یہ بتا دیا کرتے تھے کہ کون سا بادل برسے گا اور کون سا یونہی نکل جائیگا۔ ایسا نہیں تھا کہ سناٹا پہلی بار بولا ہو، یا

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

اس کمرے میں پہلی بار ایسا فقرہ ادا کیا گیا ہو جسکو پورا کرنے کے لئے دوسری بار کھکھارنا پڑا ہو اس لئے سناٹوں کی بُو اور فقروں کی ادائیگی میں تفریق کر لینے کی حس کوئی خاص وصف نہیں مانی جاتی تھی۔ پھر بھی صاحب خانہ کو دوسرے پڑوسی کے کھکھارنے کی امید بندھی مگر اس نے صاحب خانہ سے آنکھیں چار کر کے سیدھے کچھ نہ کہنے کے بجائے پہلے والے کی جانب نہ دیکھ کر بھی دیکھتے ہوئے ہونٹوں کی اندر ہی اندر تصدیق کی۔

''ہاں، گڑبڑ ہیں حالات۔''

اُس دن صاحب خانہ کو ایک بار پھر یہ تجربہ ہوا کہ اگر لفظ کسی سازش کے تحت کہیں چھپ بھی جائیں تو زبان اور بھی زندہ ہو جاتی ہے، اور اس کام کو آسمان، زمین، سڑکیں، گلیارے، بازار اور آمد و رفت کے ذرائع پورا کرنے لگتے ہیں۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ ایک چھوٹے سے فقرے کی دو بار کھکھار کر ادائیگی کے بعد لفظوں نے ان دونوں پڑوسیوں کو جیسے خالی کر دیا تھا۔ وہ دونوں ہی اس کمرے سے گھنٹہ آدھ گھنٹہ بعد ہی گپ شپ کر کے نکلتے تھے مگر انہیں لگا کہ اب ان کے پاس کہنے کو کچھ نہیں ہے اور نہ دوسرے کے گھر میں بغیر کچھ بولے چپ بیٹھے رہنے کا کوئی جواز ہے۔ اس لئے کچھ دیر بعد ایک نے دھیرے سے کہا۔

'' چلتے ہیں۔'' اور چلا گیا۔

پھر دوسرے نے بھی وہی فقرہ دہرایا اور چلا گیا۔

پڑوسیوں کے جانے کے بعد دونوں میاں بیوی مسہری پر اپنی اپنی کروٹ لیٹ تو گئے مگر انہیں نیند نہ آئی۔ صاحب خانہ نے آخر طے کیا کہ باہر کے غیر معمولی سناٹے میں کسی غیر متوقع آہٹ کو پانے کے واسطے سونے سے جاگنا بہتر رہے گا۔ اس لئے اس نے پھر کمرے کی روشنی جلائی اور پڑھنے کے لئے سرہانے سے کوئی رسالہ اٹھا کر ورق گردانی کرنے لگا۔ پھر اسے خیال آیا کہ بیوی کو بھی نیند نہیں آ رہی ہے تو اس نے بیوی کو ہوشیار کیا اور کمرے میں دبکے ورغلانے والے سناٹے کو توڑنے یا اسے بہلائے رہنے کے خیال سے کسی مضمون کی عبارت کو بیوی کو بھی سنانے کے لئے کھلی آواز میں پڑھنے لگا۔ جب وہ عبارت کے اس جملے پر پہنچا کہ ہماری بدلتی تہذیب ایک بدلتا ہوا ضمیر لیکر آ رہی ہے تو بیوی نے اسے ٹوک کر اس موقعے پر ضمیر کے استعمال کا مفہوم جاننا چاہا۔ ایسا نہیں تھا کہ بیوی تعلیم

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

یافتہ نہ تھی لیکن کبھی کبھی الفاظ ایسی نشست کے ساتھ سامنے آجاتے ہیں کہ ان کی وضاحت درکار ہوتی ہے۔ بیوی مذہبی گھرانے کی تھی اس لئے شوہر نے اسے سمجھانے کے دوران دلیلوں کو اسکے لئے مانوس بھی بنانے کی کوشش کی۔

''ضمیر اپنی تاریخ اپنے جغرافیہ اور اپنے مکان کا اسیر ہے۔'' اس نے کہا

''یعنی وہ مختلف حالات اور کیفیات سے کبھی بری نہیں ہوتا جبکہ خدا کی ذات اور صفات حالات اور کیفیات کی محتاج نہیں۔''

پھر اس نے کچھ گہرائی میں قدم رکھنے کی کوشش میں بتایا کہ ہر گروہ کا ایک ضمیر ہوتا ہے اور اسکی قوت مخفی ہوتی ہے۔ اس مخفی قوت کے مکانی حالات اور کیفیات یا تو اسے دوسروں پر قادر بناتے ہیں یا دوسروں سے عاجز۔ آخر کار بیوی کو انھوں نے اتنا تو سمجھا ہی دیا کہ یہ چھپا ہوا احساس ایسی طاقت ہے جو دوسری چیزوں کا مرکب ہے اور خدا کی طرح ہر چیز پر قادر ہونے کی قوت نہیں رکھتا، لیکن ابھی انھیں یہ سمجھانا باقی تھا کہ تاریخ اور جغرافیہ وغیرہ سے اسکا کیا سروکار ہے مگر صاحب خانہ کی بیوی کم سمجھدار نہ تھی، وہ تاریخ اور جغرافیہ کے جھمیلے میں پڑے بغیر تب تک بے خبر سو چکی تھی۔ شوہر کو دوسرے دن یہ موقعہ نہ ملا کہ بیوی کے دماغ میں اس نکتے کو بٹھاتے کہ ہماری بدلتی ہوئی نئی تہذیب کس طرح ایک نیا ضمیر لیکر آرہی ہے۔

دوسرے دن شہر کے بعض علاقوں میں بازار کچھ رینگے، آسمان پر پتنگیں اڑیں، کچھ لوگ آوازوں کے ساتھ بولے کچھ نہیں بولے، شام ہوئی تو یکایک پھر وہی سناٹا۔ صاحب خانہ کے پاس آس پاس کے گھروں کے دو تین لوگ آئے اور انھوں نے صاحب خانہ کو مشورہ دیا کہ اسے مزید تاخیر کئے بغیر وہ جگہ چھوڑ دینی چاہئے۔ ایک نے صلاح دی کہ وہ گھر میں تالا ڈال دے اور چلا جائے۔ تیسرے نے اس امکان پر بھی خاصہ زور دیا کہ جو کچھ وہ گھر میں چھوڑ کر جائے گا اس میں سے امید تو یہی ہے کہ کچھ نہ بچے اور سب جلا دیا جائے۔ حالانکہ ان تینوں نے دبی زبان سے اور غیر واضح لفظوں میں کچھ ڈھل مُل سا یہ یقین بھی دلایا تھا کہ وہ اپنی سی کوشش تو ضرور ہی کریں گے، لیکن پھر بھی گھر والے کو یہ مان کر ہی جانا چاہئے کہ جب وہ واپس آئے گا تو کچھ بھی سلامت نہ ملے گا اور ہر چیز راکھ کا ڈھیر بن چکی ہوگی۔ یہ کہکر تینوں لوگ گردن جھکا کر کچھ اس طرح کمرے سے باہر نکلے جیسے ماتم پرسی کر کے واپس

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

جا رہے ہوں۔ ان تینوں کی پیٹھ مڑتے ہی صاحب خانہ نے بیوی کو گھر کے باہر کیا اور دروازے پر تالا لگا کر ایسے ٹھکانے پر چلے گئے جہاں جگہ جگہ لوگ ٹولیاں بنائے گھروں کے باہر کھڑے کچھ بھی بول رہے تھے اور بولے چلے جا رہے تھے۔

رات دونوں میاں بیوی جب میزبان کی چھت کے نیچے بستر پر لیٹے تو ان کے پاس سوچنے کو کچھ نہ تھا۔ بیٹے بیٹوں کی شادی ہو چکی تھی، صاحب خانہ نے وقت سے پہلے رٹائرمنٹ لے لیا تھا اور اپنا وقت اب پڑھنے لکھنے میں گزار رہے تھے۔ انھوں نے خاموشی سے دو دن نکالے، لوگوں کے کہنے پر تیسرے دن وہ اپنے مکان کا حال چال لینے گئے وہ مکان انھوں نے بیس برس کی رہائش کے بعد سرکار سے خرید لیا تھا۔ انھوں نے اس یقین کے ساتھ گھر تک کا سفر طے کیا کہ وہاں سب راکھ ہو چکا ہوگا مگر جب وہ اپنے گھر کے دروازے کے سامنے جا کر کھڑے ہوئے تو دیکھا تالا آگ سے پگھلا نہیں تھا بلکہ وہ ویسے ہی لٹک رہا تھا، دراصل تالا لگاتے وقت انھوں نے کچھ بھی سوچ کر تالے کا انتخاب نہ کیا تھا، بس جو بھی اور جیسا بھی تالا ہاتھ آیا انھوں نے لگا دیا تھا۔ وہ دور سے ہی تالے کو ایک پل گھورتے رہے، تالے کی مختصر سی جسامت دیکھ کر اسکی معمولی سی حیثیت پر انھیں ہنسی آئی۔ جی میں آئی کہ وہ اس بے حیثیت کمزور سے تالے کو جا کر کھول لائیں اور گھر کو بغیر تالے کے چھوڑ دیں مگر اتنے میں پڑوسیوں نے انھیں دیکھ کر گھیر لیا، انھوں نے سب کی خیریت پوچھی ان میں سے ایک آدھ نے بتایا کہ دوسرے علاقوں سے خود ان لوگوں کے ملاقاتی سویرے سویرے اپنے گھروں میں تالا ڈال کر اور شہر کے دوسرے چھور سے مسافت طے کر کے انکے گھروں میں آ گئے ہیں۔ پھر کسی نے انھیں بتایا

''ابھی تو ٹھیک رہا ہے پر کبھی بھی کچھ ہو سکتا ہے۔''

دوسرے نے یقین کے ساتھ کہا

''خبریں اچھی نہیں ہیں''

تیسرے نے وثوق کے ساتھ مشورہ دیا

''آپ ابھی نہ آئیں، ماحول اور گرم ہو رہا ہے۔''

صاحب خانہ واپس چلے گئے۔ انھوں نے بیوی سے اتنا تو بتا ہی دیا کہ اسے کوئی امید نہ رکھنا

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

چاہئے۔ اگلے دن بیوی کو بڑی بے چینی رہی کیونکہ باہر سے آنے والے عجیب عجیب باتیں بتا رہے تھے۔ رات میں بیوی کو نیند نہ آئی۔ کیسا مر مر کر اس نے گرہستی جوڑی تھی۔ میاں بیوی بدن پر جو پہنے تھے اسی میں نکل آئے تھے۔ ایک دن اور گزرا تو بیوی نے میاں کو باہر کی سُن گُن لینے کو کہا۔ گھر کا فاصلہ میزبان کے گھر سے زیادہ نہ تھا اسلئے میاں کو پھر تیار کیا گیا کہ موقع دیکھ کر وہ ایک بار پھر گھر دیکھ آئے۔ بیوی کے بہت اصرار پر صاحب خانہ اس کا دل رکھنے کے لئے چلا تو گیا مگر اسے اپنے دروازے کو نظر اٹھا کر دیکھنے کی جستجو نہ ہوئی، سوچا جیسے سب جلے ہوئے دروازے ہوا کرتے ہیں ویسا ہی وہ بھی ہو گیا ہوگا۔ وہاں پہنچنے پر پڑوسیوں نے پھر گھیر لیا۔ ایک نے دھیمی آواز میں بتایا

"آج رات کے بارے میں کچھ سنا ہے۔"

دوسرے نے کہا" سنا ہے پیچھے کی طرف سے بڑا اچھا بنا کر آئیں گے۔"

کسی نے تصدیق کی۔ "پہلے تو تھوڑے ہی لوگ تھے مگر اب ان کے ہم خیال زیادہ ہو گئے ہیں"۔

ایک بزرگ نے صاحب خانہ کو مشورہ دیا

"اگر آپ گھر سے کچھ لے جانا چاہتے ہیں تو چپکے سے لے جایئے۔"

بزرگ کی اس ہمدردی پر انھوں نے ذہن پر زور دیکر لے جانے والی چیزوں کا ایک بار دل میں شمار کرنا چاہا۔ وہ جس چیز پر غور کرتے وہ انھیں عجیب سی اور غیر ضروری لگتی آخر کو صاحب خانہ خالی ہاتھ اپنے میزبان کے گھر واپس آ گئے۔

اس رات میزبان کے گھر کافی چہل پہل تھی، لندن سے میزبان کے بڑے سالے صاحب آئے ہوئے تھے، جو یو.این.او. کے دفتر میں معاشی معاملات کے سابق مشیر بھی رہے تھے اور جنکے والد کے بارے میں معلوم ہوا کہ دوسری جنگ عظیم کے آخری زمانے میں وہ جاپان میں تھے اور ایٹمی دھماکے کے اثرات سے اپنا ایک پھیپھڑا کھو چکے تھے۔ یہی نہیں کچھ بعد میں وہ پورے ایک برس صاحب فراش ہو کر 'کوما' میں چلے گئے آخر چچا کی درخواست پر انجکشن کے ذریعہ دوائیں خون میں پہنچا کر انھیں 'کوما' میں ہی مار دیا گیا۔ میزبان کو کیونکہ انکی فرمائش پوری کرنے کے لئے موجودہ ملکی حالات پر تبصرہ کرنا تھا اس لئے کھانے کی میز پر وہی باتیں ہوتی رہیں۔ کافی کا پیالہ ہاتھ میں آنے کے بعد میزبان کے سالے

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

صاحب نے باتوں کی گیند کو اپنے پالے میں لے لیا، وہ ایک لمبا سا پائپ پی رہے تھے جو ہندوستان کے نو دولتیوں میں زیادہ مقبول نہ تھا۔ انھوں نے گھر چھوڑ کر آنے والے مہمان کی دلچسپی کی ایک بات یہ کہی کہ دنیا میں مہذب اور باضابطہ ساجوں کی سب سے زیادہ ضرورت طاقت ور ملکوں کو اس لئے ہے کہ اسکے پیچھے ایک انتہائی بھیانک سبب موجود ہے۔ دراصل انکے بات کرنے کا انداز بڑا دلکش تھا اور کہیں سے بھی یہ نہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ لوگوں پر اپنی دانشوری کا سکہ جمانا چاہ رہے ہیں۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ عقل مند اور باخبر حضرات کی ٹولی میں اپنی ذات کا معمولی سا حصہ شریک کر رہے تھے مثلاً انھوں نے بات ہی یوں شروع کی تھی۔

''اب آپ حضرات کا بھی یہ خیال پختہ ہو چکا ہے کہ ہمیں ناچار ہی دو طرح کے ساجوں میں ایک ساتھ رہنا پڑ رہا ہے اور ان ساجوں کی آپ نے جو شناخت کی ہے وہ تو اب جگ ظاہر ہے۔'' لوگوں کو جب ان کی بات میں اپنی بات نظر آئی تو وہ متوجہ ہو گئے بلکہ ایک نے تو پوچھ بھی لیا کہ'' دو طرح کے ساج کونسے ہیں۔''

''ایک ساج تو وہ ہے جس کو آپ سب حضرات نے مہذب ساج کا نام دیا ہے'' وہ فوراً بولے'' اسکو آپ باضابطہ ساج بھی کہتے ہیں اور دوسرا ساج وہ ہے جو خطرناک بین الاقوامی مافیا کا ساج ہے اسمگلروں اور دہشت گردوں وغیرہ کا ساج ہے جو موجود تو ہے مگر ساج کی مروجہ تعریف میں نہیں آتا لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہر سال پوری دنیا میں کم سے کم ایک لاکھ چالیس ہزار افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے'' یہ کہکر انھوں نے پائپ کا کش لیا بعد میں کافی کا چھوٹا سا پُر تکلف گھونٹ بھی اس طرح لیا جو ان کے کلاس کا نمائندہ تھا پھر دھیرے سے بڑبڑائے

''ایک لاکھ چالیس ہزار کی گنتی اس لئے استعمال کر رہا ہوں کہ ناگاساکی میں ایک بم سے کم سے کم اتنے ہی مہذب ساج کے لوگوں کے ہلاک ہونے کی سرکاری تعداد مقرر کی گئی ہے۔''

یو.این.او. سے آئے ہوئے میزبان کے بڑے سالے صاحب نے جو باتیں کیں وہ اپنے گھر میں تالا ڈالکر اور بیوی کو ساتھ لیکر آنے والے مہمان کو صرف اس لئے پریشان کُن نہیں لگی تھیں کہ رات کے سناٹے میں کہیں شور وغُل اُٹھ رہا تھا بلکہ انھیں ایسا لگا جیسے ان باتوں

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

نے ان کی پناہ گاہ کو ایک بدبودار چوہے دان میں تبدیل کر دیا ہے۔ سب لوگوں کے بستر پر چلے جانے کے بعد بھی مہمان کھڑکی پر کھڑا باہر کے اندھیرے کو دیر تک گھورتا رہا پھر جب وہ بستر پر لیٹا تو وہی باتیں کان پر لگے لاؤڈ اسپیکر کی طرح دیر تک چیختی رہیں۔ پاس ہی بچھے بستر پر دراز بڑے سالے صاحب پر اسکی نظر پڑی جواب سو چکے تھے۔ مہمان کو اندھیرے میں لگا جیسے لیٹے ہوئے سالے صاحب کا پورا بدن کالا پڑ گیا ہے اور انکی کھال پر لمبے لمبے سخت اور کھڑے کھڑے روئیں اُگ آئے ہیں اور منہ ایک لمبے سے تھوتھن میں بدل گیا ہے۔ مہمان پر غنودگی سی چھانے لگی تھی اسی غنودگی میں اسے لگا جیسے وہ اپنے بستر سے اٹھ کر پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گیا ہے۔ پھر سلیپر پہن کر کھڑا ہو گیا ہے۔ اور چار قدم چل کر سالے صاحب کے پلنگ کے پاس پہنچ گیا ہے پھر وہ انکے کندھے پر ہاتھ رکھ کر انھیں ہوشیار کر کے مخاطب کر رہا ہے اور تخاطب میں 'آپ' کے بجائے 'تم' کا استعمال کر رہا ہے اور پہلا فقرہ یوں ادا کر رہا ہے۔

''تو تم سمجھتے ہو کہ باضابطہ سماج غیر قانونی سماج کے مقابلے میں تخریبی سرگرمیوں کا زیادہ شکار رہا کرتا ہے۔؟''

''ہاں میں ایسا سمجھتا ہوں۔'' میزبان کے یو.این.او. سے آئے سالے صاحب بڑبڑاتے ہیں

''اور مہذب سماج پر فتح پانا غیر قانونی سماج پر فتح پانے سے زیادہ آسان ہے؟''

''یقیناً''

''کیونکہ تمہارے مشاہدے کے مطابق غیر قانونی سماج پر نیوکلیئر بم استعمال نہیں کیا جا سکتا؟''

سالے صاحب نیند کے غلبے سے ہوشیار ہونے کی کوشش کرتے ہیں پھر کہتے ہیں۔

''ہاں ملیٹری اسٹریجڈی میں ٹیکٹیکل ٹکنالوجی (Tactical Technology) اس فضول خرچی کی اجازت نہیں دیتی''

''اور تم ایسا مانتے ہو کہ نیوکلیئر بم صرف مہذب سماج کے لئے بنا ہے؟''

''بالکل کیونکہ دوسری جنگ کے بعد کے جائزے بتاتے ہیں کہ اب تک صرف ایک ہی ملک پچاسوں بار مہذب سماجوں پر ہی یہ بم گرانے کی دھمکی دے چکا ہے۔''

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

''تو تمہارا خیال ہے کہ اصل فتح کا تصور مہذب سماج کی غارت گری کا دوسرا نام ہے؟''

''یہ میرا نہیں عالمی فوجی مشیروں کا خیال ہے۔''

''تو کیا اسی لئے سماجوں کو مہذب بنائے رکھنے پر سب ہی زور دیتے ہیں؟''

''ہاں، میں اسی نتیجے پر پہنچا ہوں۔''

''کیا اسی سبب تم یہ کہتے ہو کہ تسلیم شدہ سماج میں رہنا غیر تسلیم شدہ سماج میں رہنے سے زیادہ خطرناک کام ہے؟''

سالے صاحب جواب میں دھیرے سے مسکرائے، بڑی مہذب اور خفیف سی مسکراہٹ جسے مسکرا لے جانا شائد ہر ایک کے بس کی بات نہ تھی کہ اس مسکراہٹ کے اندر کا زہر عنقا تھا۔ پھر شائستگی سے بولے

''یہ اس لئے خطرناک ہے کہ آپ گھر کے دروازے پر تو تالا لگا کر بھاگ سکتے ہیں مگر اپنی آبادی کے دروازے پر تالا کیسے ڈالیں گے اور کہاں بھاگیں گے۔''

اس جواب پر گھر پر تالا ڈالکر آئے مہمان کو ایک جھٹکا لگا وہ بڑبڑایا

''تو گویا مہذب سماج میں رہنا پگھلا دینے والی آگ کے درمیان بسر کرنے کا نام ہے''

''ہاں ویسے ہی جسکی دو مثالیں دنیا میں موجود ہیں۔''

پھر مہمان کو لگا جیسے وہ یو. این. او. سے آئے میزبان کے بڑے سالے صاحب کی پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گیا ہے اور اپنی آنکھیں پاس لے جاکر سالے صاحب کے چہرے کو غور سے دیکھ رہا ہے جسکے تھوتھن سے دونو کیلے دانت باہر نکلے ہوئے ہیں یہ دیکھ کر مہمان کا تخاطب یکا یک تم سے تو میں بدل گیا۔

''سالے، تُو اتنا سب کچھ بھلا کیسے جان گیا ہے؟''

سالے صاحب اس تخاطب پر برا نہیں مانتے، وہ مسکرا کر بدبداتے ہیں۔

''ہم جاننے کی ہی حماقت کرتے ہیں۔''

''اسکے بعد بھی تُو بھانت بھانت کے ٹوبا کو پائپ جمع کرنے میں لگا رہتا ہے؟''

''ہاں'' وہ برا مانے بغیر جواب دیتے ہیں۔

''اس کے بعد بھی تیرے پاس ایک ٹرنک بھر کر صرف رنگ برنگی ٹائیاں ہیں؟''

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

''بے شک۔''

''اور تیرے چہرے کی کھال کے پیچھے میدہ اور شہاب جیسا رنگ اور آنکھوں میں ستارے جگمگاتے ہیں۔؟''

سالے صاحب کو اس سوال کا اس لئے بھی برا ماننا پڑا کیونکہ شاعری انکے لئے گالی بن چکی تھی اس لئے بھڑک کر بولے

''حضرت، سب شاعری کر کے روٹی کھانے لگیں تو باپ کو مرنے سے پہلے انجکشن دیکر کیوں مارا جائے۔ گیٹ لاسٹ!''

مہمان جب سویرے اپنے بستر سے اٹھا تو دھوپ کافی پھیل چکی تھی، آنکھیں ملتے وقت اسے یہ بھی یاد نہ رہا تھا کہ میزبان کے بڑے سالے صاحب سے اسکا مکالمہ خواب تھا یا بیداری یا یہ کہ ایسا کوئی مکالمہ ہوا بھی تھا؟

مکان میں تالا لگا کر آنے والے میاں بیوی نے اس دن کا سارا وقت منہ لٹکائے ہوئے گزارا رات آئی تو دن بھر کی کسلمندی کے بعد بیوی کو نیند جلدی آ گئی، لیکن شوہر جاگتے رہے، دیر رات انھیں پھر دور کہیں سے شور وغل کی آوازیں سنائی دیں، انھیں کچھ ایسا لگا کہ جیسے کسی کے تالا لگے دروازے پر پٹرول چھڑکا جا رہا ہے پھر اس گھر کی ایک ایک چیز انھوں نے جلتے ہوئے یوں دیکھی جیسے وہ سب ان کے سامنے ہی ہو رہا ہو، مگر اُس منظر سے دہشت غائب ہو چکی تھی لگ رہا تھا جیسے بچے پھلجھڑیوں کی روشنی سے کھیل رہے ہوں۔ ایک دو روز ہی گزرے تھے کہ اطمینان بخش خبریں آنے لگیں، سڑکوں پر چہل پہل رینگنے لگی اسی دوران ان کے میزبان نے خبر دی کہ اب مہمان کے علاقے میں سب ٹھیک ٹھاک ہے اور اب میاں بیوی بے فکر ہو کر اپنے ٹھکانے پر جا سکتے ہیں۔ لیکن بیوی نے انھیں مشورہ دیا کہ وہ ایک بار اکیلے ہی جا کر پڑوسیوں سے حال چال لیں اس لئے میاں بوجھل ذہن کے ساتھ میزبان کے گھر سے نکلے، پاس ہی میدان میں کچھ بچے کرکٹ کھیل رہے تھے، شوہر آگے بڑھے تو کسی کے دروازے پر کوئی ایمبولنس بوڑھے مریض کو اتار رہی تھی۔ انھیں بدن پر تازی ہوا لگی پھر بھلی لگنے والی دھوپ کا بھی احساس ہوا، محلے کے موڑ پر پہنچے تو مونگ پھلی کا ٹھیلے والا ملا، مڑتے ہی اگر وہ نگاہ اٹھاتے تو گھر کا دروازہ ان کی زد میں تھا مگر وہ سیدھے تین گھر چھوڑ کر

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

اس پڑوسی کے دروازے پر گئے جو سب سے پہلے انھیں آگاہ کرنے انکے کمرے پر آیا تھا۔ آواز دی تو ایک اجنبی عورت دروازہ سرکا کر اندر سے جھانکی انھوں نے خاتون سے صاحب خانہ کے بارے میں دریافت کیا تو وہ اندر چلی گئی ذرا دیر بعد گھر کی مالکن دروازے پر آئی اور پوری کھلی آنکھوں سے انھیں دیکھنے لگی، وہ پڑوسی کی بیوی کو پہچان گئے ابھی عورت انھیں کسی اجنبی کی طرح غیر متوقع طور پر گھور ہی رہی تھی کہ مختلف عمروں کے دو انجان سے بچوں نے دروازے کے پیچھے سے گردنیں نکالیں تب انھیں لگا کہ انکے میزبان کے گھر کی طرح شائد وہ گھر بھی غیر محفوظ علاقوں سے آئے افراد کی میزبانی انجام دے رہا تھا مکان کی مالکن نے انھیں کچھ اس طرح پہچانا جیسے پوری طرح پہچان نہ پائی ہو بہر حال اس نے انھیں بتایا کہ گھر والا موجود نہیں ہے تو وہ آگے بڑھ گئے۔ دوسرے دروازے پر پکارنے پر گھر کا مکین باہر آیا تو گھر چھوڑ کر گئے صاحب خانہ نے مسکراتے ہوئے اپنا ہاتھ مصافحے کے لئے آگے بڑھا دیا۔

پڑوسی کے ہاتھ کو بڑھنے میں دیر لگی اسکے ہاتھ کا لمس اور انگلیوں کی پکڑ سے انھیں لگا جیسے وہ بلئی کے پنجے سے ہاتھ ملا رہے ہوں۔ پھر پڑوسی کو بتایا کہ کچھ دیر بعد وہ بیوی کو میزبان کے گھر سے لیکر واپس آجائیں گے پڑوسی اسکے ردعمل میں آسمان پر اڑتی ہوئی پتنگ کو یوں دیکھنے لگا گویا اس وقت اس اڑتی ہوئی پتنگ کو دیکھنے کا کام دوسری باتوں کے مقابلے میں زیادہ ضروری تھا۔

جب وہ میزبان کے یہاں واپس آئے تو بیوی انکا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی، وہ انھیں الٹے پیروں اپنے ساتھ واپس لائی دونوں گھر کے دروازے کی سمت پر تھے، بیوی دور ہی سے دروازے کو دیکھ کر اطمینان کا سانس لے چکی تھی اسکے قدم بے تابی سے گھر کی جانب بڑھنے لگے مگر شوہر کی رفتار میں غیر معمولی سستی اور تھکن تھی۔ ایک بار شوہر کے جی میں آئی کہ وہ بیوی کو آواز دیکر گھر کی طرف جانے سے روک لے اس اثناء میں بیوی نے جب اسے پلٹ کر دیکھا تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے بیوی کو ٹہرنے کی ہدایت کی۔

بیوی رک گئی۔ جب وہ قریب پہونچا تو فکرمندی سے سوال کیا۔

''تم کہاں جا رہی ہو۔۔؟'' بیوی شوہر کا منہ دیکھنے لگی

''گھر چل رہے ہیں نا۔۔۔؟'' پھر مشکوک لہجے میں کریدا

''یہ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟'' شوہر ایسی آواز میں جسے وہ خود بھی مشکل سے سن سکا

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

بڑبڑایا

''ممکن ہے شام کو پھر کچھ لوگ تالا ڈالنے کو کہنے آئیں'' بیوی کچھ سمجھے بغیر گھر کی طرف گھوم گئی۔ شوہر کے قدم نہ اٹھے تب تک بیوی دروازے تک پہنچ گئی تھی، پھر وہاں سے اسے یکا یک بیوی کی اونچی آواز سنائی دی۔

''ذرا جلدی آیئے۔'' غیر ارادی طور پر اس نے قدم تیز کر دیئے۔ بیوی دروازے پر حیران کھڑی تھی شوہر کے پہنچنے پر گھبرا کر بولی

'' لگتا ہے آپ نے جلدی میں سانکل کنڈے میں پھنسائے بغیر تالا لگا دیا تھا گھر تو کھلا ہی رہ گیا۔''

شوہر بغیر کسی ردعمل کے دور پڑے کچرے کے ڈھیر کی جانب دیکھنے لگا۔ بیوی نے شتابی کے ساتھ گھبراہٹ میں گھر کا دروازہ کھولا، کئی روز سے گھر میں بند بوجھل سی ہوا بیوی کے نتھنوں میں رینگی وہ اندر قدم رکھ کر ہر جانب کا جائزہ لینے لگی، اسے سب ٹھیک ٹھاک ہی نظر آ رہا تھا، اس نے دہلیز کے باہر بے تعلق سے کھڑے شوہر کے ہاتھ کو پکڑ کر کمرے میں کھینچا

''اندر آیئے وہاں کیا کر رہے ہیں؟'' شوہر کو یکا یک ایک جھٹکا سا لگا اور وہ یہ سوچ کر الجھن میں پڑ گیا کہ کیا وہ ابھی گھر میں نہ ہو کر گھر سے باہر کھڑا تھا؟ اور بس دوسرا قدم بڑھاتے ہی اسکی جگہ بدل گئی؟ آخر یہاں اور وہاں کی تفریق سے بیوی کی کیا مراد تھی؟ ابھی وہ اس الجھن میں تھا کہ دور سے پڑوی اسکے گھر کی جانب آتے دکھائی دیئے۔ وہ غور سے دیکھنے لگا۔ ''وہ آرہے ہیں۔'' اس نے سوچا۔ ''یہ بتانے کہ اب تالا ڈالنے کا بھی وقت نہیں ہے۔'' تب تک بیوی دوسرے کمرے کا جائزہ لے چکی تھی۔ اس نے شوہر کو پھر آواز دی اس آواز پر اس نے دہلیز سے کمرے کے اندر قدم رکھا اور ٹھٹھک گیا۔ چند ساعتوں کے لیے اسے لگا جیسے میزبان کے بڑے سالے صاحب صوفے پر بیٹھے کافی کی چسکیاں لے رہے ہیں اس نے گھبرا کر پوچھا۔ '' آپ یہاں کیسے؟'' جواب میں مسکرائے '' آپ ابھی تک یہاں، اور وہاں کے مغالطے میں ہیں۔'' پھر جیسے صوفے پر سے ایک بڑا سا شعلہ بھڑکا اور بڑے سالے صاحب دھویں میں تحلیل ہو گئے۔ شوہر نے گھبرا کر صوفے کے ہتھے کو انگلی سے چھوا پھر انگلی کو غور سے دیکھا، ان کی انگلی پر جلے ہوئے صوفے کی راکھ لگ گئی تھی۔ کالی کالی

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

سی راکھ جس کو انھوں نے دہشت کے ساتھ جھاڑ دیا، جیسے کوئی جلی ہوئی لاش چھو لی ہو۔ وہ بیڈروم میں گئے جہاں ان کا بستر، مسہری اور ٹی وی وغیرہ تو شاید اسی وقت جل کر راکھ ہو گئے تھے جس وقت انھوں نے دروازے پر تالا لگا کر گھر چھوڑا تھا، بیوی اب تک الماری کے لاکر کا جائزہ لیکر خوش ہو چکی تھی، اس نے اپنی خوشی میں شوہر کو شامل کرنا چاہا۔

''ہر چیز اپنی جگہ پر ہے۔ یہ تو معجزہ ہو گیا''۔

پھر بیوی نے تازی ہوا اور روشنی کے لیے کھڑکی کھولی اور بستر جھاڑ کر مسہری پر دراز ہوئی۔ شوہر کھلی ہوئی کھڑکی کے پاس گیا ایک ہاتھ سے کھڑکی کی لوہے کی سلاخ پکڑی اور باہر کی طرف جھانکا سلاخ پر سے ہاتھ ہٹایا تو دیکھا کسی دیمک لگی کھوکھلی لکڑی کی طرح سلاخ پر انگلیوں کی گرفت والا حصہ ٹوٹ کر ان کی مٹھی میں آ گیا تھا۔ بیوی نے ایک بار پھر بستر پر کروٹ لیتے ہوئے گھر کی ایک ایک چیز اپنی جگہ پر موجود ہونے کی اس حیرت انگیز انہونی پر خوشی کا اظہار کیا۔ تو شوہر کو بھی مکان کے جلے ہوئے فرش پر ہر چیز اپنی جگہ پر ہی دکھائی دینے لگی۔ مگر ہر چیز جہاں تھی وہاں جل چکی تھی اور ان کے جلے ہوئے ڈھانچے ہی قائم رہ گئے تھے۔ یہاں تک دیوار پر لگی گھڑی کچھ اس طرح جل چکی تھی کہ اس کی جلی ہوئی پرچھائیں دیوار پر چپک کر رہ گئی تھی۔

شوہر نے جلی ہوئی کھڑکی سے باہر ایک بار پھر نگاہ کی، کچرے کے ڈھیر کی جانب ایک دبلی پتلی سُورنی اِدھر اُدھر بھاگ رہی تھی اور دو تین بچے تھنوں سے لپٹنے کے لیے اسے گھیر رہے تھے۔ انھیں پیاس محسوس ہوئی تو کچن میں جا کر فرج سے پانی نکالا، دیکھا پانی سیاہ پڑ چکا تھا۔ انھوں نے بیوی سے یہ کہنے کے لیے بستر کی جانب پلٹ کر دیکھا کہ رات کے کھانے کا انتظام کیسے ہوگا مگر انھیں نظر آیا کہ بستر پر دراز بیوی کی آنکھیں بند ہیں۔ انھیں یہ محسوس کر کے کوئی خاص بے اطمینانی نہ ہوئی کہ بیوی 'کوما' میں جا چکی ہے وہ پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگے۔ بچوں نے اب سُورنی کو جا لیا تھا انھیں یہ دیکھ کر بدن میں ایک جھرجھری سی اٹھی کہ بچوں کی ننھی ننھی تھوتھنیوں سے انکے نکیلے دانت ابھی سے باہر جھانکنے لگے تھے۔

(۱۹۹۹ء)

□□□

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

بے شمار

مانو کا کمرہ بہت دنوں تک اسے ٹماٹر جیسا لگتا رہا اس نے گھر والوں سے کئی بار خواہش ظاہر کی کہ کمرے کو اس اوزار کے درمیان رکھ کر دبا دیا جائے جس سے ٹماٹر کے قتلے بن جاتے ہیں تو کمرے کے قتلے بھی بن جائینگے وہ ان قتلوں کو دیکھنا چاہتا ہے پہلے تو مانو کو سمجھایا گیا کہ ایسا کرنے میں مانو کے سارے سامان اور خود مانو کے بھی قتلے بن جائینگے لیکن جب اس پر بھی مانو اپنے کمرے کو بدلی ہوئی حالت میں دیکھنے کا اصرار کرتا رہا تو گھر کے لوگ فکر مند ہو گئے۔ مانو کی ذہنی دنیا میں ایسی کون سی اُتھل پتھل ہو رہی تھی اس کو سمجھنے کے لئے جس کرب سے اس کے گھر والے گزر رہے تھے نا تو مانو کو اس کا احساس تھا اور نہ اس بات کا اس پر کوئی بوجھ کہ لوگ اسے سمجھ نہیں پا رہے۔ اسے اطمینان تھا کہ کسی دن اس کی یہ خواہش پوری ہو جائیگی۔

دراصل مانو کی طرح اس کے گھر والوں کو بھی یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ سب کیسے ہوا؟

مانو نے تعلیم کے زمانے میں ہمیشہ امتیازی حیثیت سے کامیابیاں حاصل کیں۔ دو بار ڈبل پرموشن پا کر اس نے ایم.اے. بڑی کم عمری میں کیا۔ گولڈ میڈل پانے پر نہ اس کو حیرت ہوئی نہ اور دوسروں کو۔ مانو کو جب اس کے دوست سڑک کے کنارے پرانی کتابوں کے لگے ڈھیر کے پاس کھڑے ہوئے پاتے تو یہ سمجھ جاتے کہ میتھ میٹکس کی کوئی کتاب اسکے ہاتھ لگ گئی ہے۔ مزہ تو اسکے دوستوں کو تب آتا جب وہ کسی سوال کو سمجھانے کے لیے کاغذ پر لکھتے لکھتے اس کے آخری سرے تک پہنچ جاتا اور کاغذ پر جگہ نہ رہ جانے پر کاغذ کے نیچے رکھے تکئے کے سفید غلاف پر سوال کا باقی حصہ حل کرنے لگتا اور تکیہ غلاف کے ختم ہو جانے پر تکئے کے نیچے مانو کے دودھیا لٹھے کے پائجامے کی پھر باری آجاتی اور مانو کا قلم پائجامے پر چلنا شروع ہو جاتا۔

ایک دن مانو صبح کا ناشتہ کر رہا تھا۔ ماں نے اسے دودھ اور دلیا دیا تھا۔ اس نے کٹورے میں چمچہ ڈالا ہی تھا کہ اسے لگا کہ کٹورے میں دودھ اور دلیے کے درمیان کوئی گھوڑ

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

اکھڑا ہے اور اس کی پیٹھ پر ایک مینا بیٹھی ہے۔ اس نے نہ تو اس بات کا کسی سے ذکر کیا اور نہ اصرار کہ کٹورے میں گھوڑا اور مینا ہے۔ اسے یقین تھا کہ جب کچھ ہے تب ہی تو اسے دکھائی دے رہا ہے۔ اور اگر نہیں ہے اور اسکے باوجود بھی دکھائی دے رہا ہے۔ تو پھر یہ مانو کا قصور نہیں ہے۔ قصور تو اس شئے کا ہے یعنی وہ شئے دکھائی دیتے وقت دیکھی جانے والی جگہ پر خود وجود کیوں نہیں رکھتی۔ مانو نے پاس ہی رکھی خالی رکابی کی طرف دیکھا تو اسے لگا کہ رکابی کی صاف ستھری سطح پر بارات کے باجے والے بھڑکیلی وردیاں پہنے باجہ بجا رہے ہیں اور اچھلتے ناچتے باراتی جلوس کی شکل میں چل رہے ہیں۔ مانو کو ہمیشہ سے گاجے باجے اور شور شرابے سے نفرت تھی غالباً اس کی ایسے گاجے باجے سے علحیدگی پسندی کی وجہ وہی تھی جو کسی کٹر ہندو کو مسلمان سے یا کٹر مسلمان کو ہندو کو دیکھ کر ہو سکتی ہے۔ لیکن سب کے معلوم کرنے پر کوئی معقول وجہ خدا جانے کیوں نہیں نکلتی اور اگر نکلتی بھی ہے تو وہ ایک کے لیے تو معقول ہوتی ہے۔ اور دوسرے کے لیے نامعقول۔ وہ بڑا انتہائی پسند تھا۔ باراتوں کو دیکھ کر برابر والی گلی میں گھس کر راستہ کاٹ دیا کرتا۔ رکابی سے نگاہیں ہٹا کر اس نے کٹورے میں جھانکا۔ مانو کو حیرت ہوئی کہ گھوڑا اب غائب ہو چکا تھا اور وہاں صرف مینا رہ گئی تھی۔ مانو کو پرندے اچھے لگتے تھے اس کی ماں بچپن میں اکثر مانو کو دودھ نہیں پینے پر جھوٹ موٹ منڈیر پر بیٹھے کسی فرضی کوّے کو بلایا کرتی تھی۔

"آؤ کوّے مانو کا دودھ پی جاؤ" کوّے کو دی جانے والی دعوت پر مانو جلدی سے اپنی نگاہیں منڈیر پر ڈال دیتا اسے پورا یقین تھا کہ کوّا دودھ پی کر گورا ہو جائیگا اور کالا بالکل نہ رہے گا۔ کیونکہ ماں کو اکثر وہ یہ بھی کہتے سنتا تھا کہ جو بچے دودھ پیتے ہیں وہ خوب گورے ہو جاتے ہیں، وہ ہر گورے بچے کو دیکھ کر بہت خوش ہوتا تھا کہ اس کا دودھ کوّے نے نہیں پیا ہے۔ یقین اگر نہ ٹوٹے تو خوشی بھی ہوتی ہے اور آسودگی کا احساس بھی۔ مگر مانو کو حیرت تھی کہ اس کے کٹورے کا گھوڑا آخر کہاں غائب ہو گیا۔ کب اور کیسے چیزیں غائب ہو جاتی ہیں یہ بات مانو کے لیے ہمیشہ ایک الجھن کھڑی کر دیتی وہ اپنے آس پاس ہنستے بولتے، کھاتے پیتے خوش گپیاں کرتے لوگوں سے پوچھنا چاہتا مگر اسے پتہ لگتا کہ ان لوگوں کی کبھی کوئی چیز غائب ہی نہیں ہوئی۔ تب مانو نے اپنے ایسے یقینوں کو جو ٹوٹ جایا کرتے

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

تھے گنتی کرنے کے لیے ہمیشہ انھیں ایک نوٹ بک میں نوٹ کرنا شروع کر دیا۔ کٹورے کی مینا کے دیکھنے کے بھولے سے انداز نے جب مانو کو اس کی طرف متوجہ کر لیا تو مینا نے اس کو اس کا نام لیکر پکارا۔ ''مانو''۔ مانو اس کی زبان سے اپنا نام سن کر خوشی سے اچھل پڑا۔ وہ چلایا ۔''مینا باہر آؤ'' پھر وہ بار بار مینا باہر آؤ، مینا باہر آؤ کی رٹ لگانے لگا۔ ناشتے کی میز پر پاس بیٹھی اس کی بہن جو اس سے دو سال بڑی تھی اور اپنی سسرال سے باپ کی بیماری کے سبب ان دنوں آئی ہوئی تھی۔ مانو کو غور سے دیکھنے لگی۔ پھر اس نے دیکھا کہ مینا کو باہر لانے کے لیے وہ کٹورے کا دلیا رکابی میں انڈیل رہا ہے۔ دلیا بکھر گیا مگر مینا کا تب بھی کوئی پتہ نہ تھا۔ مانو اداس ہو گیا۔ اسے یقین تھا کہ مینا باہر آجائیگی۔ لیکن اس کے نہیں آنے پر مانو نے اپنی نوٹ بک کھولی اور اس ٹوٹے ہوئے یقین کو بھی اپنی فہرست میں جوڑ لیا۔ لیکن مانو کے گھر والوں پر جیسے بجلی سی گر پڑی۔

جب مانو کا میڈیکل چیک اپ ہوا تو ذہنی مریضوں کے ماہرین کافی دنوں تک اسے ایک سے دوسرے کی جانب اچھالتے رہے۔ مانو کے دیکھنے کا انداز کبھی کبھی یکسر بدل جاتا۔ دونوں ہاتھوں کی پانچوں انگلیوں کو آپس میں پھنسا کر وہ بار بار جکڑتا اور کسی کلدار کھلونے کی طرح اپنی گردن کو ادھر ادھر گھماتا اس وقت اس کی آنکھیں چھت کو تکتی ہوتیں ہونٹوں میں بے ہنگم سی جنبش ہوتی جس سے چہرہ بدرو ہو جایا کرتا کچھ دیر بعد بے ربط جملے ہونٹوں کے کناروں سے بہنے والا منہ کا لعاب وغیرہ سب غائب ہو جایا کرتا اس کی جگہ شیو کیا ہوا چکنا چمکدار اور توانا چہرہ ابھر آتا آنکھوں میں ذہانت کی چمک واپس آجاتی اور وہ ذہنی امراض کے ماہرین سے ایسی باتیں کرتا اور ایسے موضوعات پر باتیں کرتا کہ ان کے ہوش اڑ جاتے۔

مانو کو کبھی اپنی بیماری کا گزرا ہوا زمانہ یاد بھی نہ رہتا اور وہ اپنے کمرے کی اکلوتی کھڑکی کے سامنے چپ چاپ صاف ستھرے کپڑے پہنے بیٹھ جاتا۔ سامنے کی چھ منزلہ عمارت کے کمروں کی کھڑکیوں کے اس پار ساڑیاں دوپٹے اور آتے جاتے جسموں کی جھلک دیکھا کرتا۔ ان مناظر کے سارے رنگ اسے اچھے لگتے تھے۔

آخر کو مانو کو اس کے باپ نے ممبئی لے جانے اور وہاں کے ایک ماہر کو جس کے

بڑے چرچے تھے دکھانے کا فیصلہ کیا۔ان دنوں مانو کی کیفیت پرانے دوروں سے مختلف تھی اس کی آنکھیں، چہرہ، ہاتھوں کی حرکت اور مسکراہٹ وغیرہ سبھی ٹھیک ٹھاک تھا۔لیکن اس پر ایک عجیب سی جذب والی کیفیت طاری ہوگئی تھی وہ اکثر کہتا کہ اسے اب بہت کچھ دکھائی دے رہا ہے۔مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ رنگوں کی شناخت میں ایسی غلطیاں کرنے لگا تھا کہ بچے بھی نہیں کرتے۔ایک دن ماں کے دھانی دوپٹے کو اس نے نیلا دوپٹہ بتایا تھا۔بہن سے اس بات پر ناخوش ہوا کہ وہ نیلے جمپر پر کالی شلوار کیوں پہنے ہے جبکہ شلوار سفید تھی ،،بہن نے اسے یقین دلانا چاہا کہ اس کی شلوار کالی نہیں سفید ہے مگر مانو کو بہن کی کھلی دھاندلی پر نہ تو غصہ آیا اور نہ ترس کیونکہ اسے یقین تھا کہ شلوار سفید نہیں کالی تھی۔

ممبئی میں مانو کی بہن کی کھاتی پیتی سسرال تھی۔ماہر امراض کے بارے میں ان لوگوں نے مانو کے والد کو بتایا کہ ڈاکٹر فطرتاً ایک لالچی اور لت کی حد تک ریس کا کھلاڑی ہے۔اسے کڑکڑاتے نوٹوں کو تاش کی گڈی کی طرح پھڑ پھڑانے کا جنون ہے۔شراب اور گھڑ دوڑ کے شوق نے اسے تباہ کر رکھا ہے۔جب اس ماہر سے مانو کو ملوایا گیا تو مانو ڈاکٹر کی میز کے سامنے والی کرسی پر بیٹھا ہی نہیں۔وہ کلینک کے اس بے ترتیب اور منحوس سے کمرے کے فرش پر ڈاکٹر کو نظر انداز کر کے چہل قدمی کرنے لگا اور فریم میں لگی اور دیواروں پر ٹنگی اسناد کو غور سے دیکھتے ہوئے قبل اس کے کہ ڈاکٹر اس سے کچھ پوچھے الٹا مانو اسی سے سوالات کرنے لگا۔

''ریس کھیلتے ہو''؟۔ڈاکٹر مسکرایا اور ہاں میں جواب دیا۔

''میرے خیال میں اس بار بھی غلطی کر رہے ہو۔''مانو کی اس اچانک کہی جانے والی بات پر دو پل خاموشی رہی۔پھر ڈاکٹر کا سوال تھا۔

''کیسی غلطی''جواب دیا گیا۔

''تم اپنے ٹوٹے ہوئے یقینوں کی گنتی میں ایک کا اور اضافہ کرنے جا رہے ہو۔''

''مطلب۔''ڈاکٹر نے آنکھیں پھاڑیں تو پھر سوال ہوا۔

''بلیک ڈائمنڈ پر داؤں لگانے جا رہے ہو نا''۔

''ہاں لگا تو رہا ہوں''۔

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

''وہ گھوڑا نہیں ٹٹو ہے۔ نپولین تھنڈر پر لگاؤ''

ابھی مانو نے جملہ پورا کیا تھا کہ ڈاکٹر کی جوان اور بلا کی خوبصورت لڑکی چھوٹے سے کتے کو گود میں لیے اندر آئی اور باپ کی میز کی دراز میں کچھ تلاش کرنے لگی۔

''ہیلو'' مانو بڑے انداز سے لڑکی سے مخاطب ہوا'' آپ واقعی میں بہت خوبصورت ہیں۔'' لڑکی نے مسکرا کر اس کامپلیمنٹ پر اظہار تشکر کیا ہی تھا کہ مانو نے آگاہ کیا۔'' اپنے باپ سے کہیئے کہ میری بات مانیں اور کل کی ریس میں نپولین تھنڈر کھیلیں۔ ڈاکٹر نے پتہ نہیں کیوں بات مان لی، مگر اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ جب اس نے اپنی دور بین میں نپولین تھنڈر کو سب سے آگے پایا۔

ڈاکٹر نے اگلی ریس کے گھوڑے کے بارے میں اپنے مریض کو کریدنا شروع کر دیا تو مریض اس سے پوچھ بیٹھا۔'' ایسا کیوں ہوتا ہے کہ کبھی آپ کو ویسا ہی اور وہی دکھائی دیتا ہے جیسا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر کے پاس جب اس کا کوئی جواب نہ ملا تو مانو نے اسے اگلی ریس کا فاتح گھوڑا بتا دیا۔ اس شام کو ڈاکٹر معہ اپنی بیٹی کے مانو کے لیے قیمتی تحائف کے ساتھ اسکے گھر آیا۔ ڈاکٹر کی لڑکی اسے رجھانے والی اداؤں کے ساتھ برابر دیکھتی رہی۔ دوسرے دن کی شام ڈاکٹر کی خوبصورت لڑکی مانو کو لیکر او بیرائے کے لان میں بیٹھی تھی اور میز پر بیئر کی جھاگ اڑاتے کٹ گلاس والے مگ رکھے تھے۔ پھر تو یہ ہوا کہ رات کا کھانا مانو اپنی بہن کے گھر پر نہیں بلکہ اس خوبصورت لڑکی کے منتخب کیے ہوئے کسی ہوٹل میں کھاتا جس کا بھاری بل وہ لڑکی ادا کرتی۔ مانو کو بڑی خوشی اس بات کی تھی کہ جتنی بار بھی اس نے ڈاکٹر کی لڑکی کے ساتھ بیئر پی مانو کو بیئر کا رنگ سنہرا ہی دکھائی دیا۔ مگر ایک دن قدرے اداس لہجے میں اس لڑکی سے جسے اب وہ پیار سے مینا پکارنے لگا تھا اس نے سوال کیا۔

''ایسا ہمیشہ ہمیشہ ہی کیوں نہیں ہوتا کہ بیئر کا رنگ سنہرا ہی دکھے۔'' مینا جواب میں مسکرا دی تھی وہ بھی مسکرایا تھا۔

''کتنا اچھا موسم ہے یہ'' اس نے کہا تھا'' جو کچھ جیسا ہے ویسا ہی دکھائی دے رہا ہے۔ بیئر واقعی صرف سنہری ہے۔'' مگر مینا کا دل کہیں اور لگا تھا فش دودھ کریم کا ایک ٹکڑا کانٹے سے اٹھا کر منہ میں رکھتے ہوئے کہہ دیا۔

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

''مانو ڈیر کوئی گھوڑا مجھے بھی بتاؤ نا''۔

''گھوڑے تو تمھاری راہ دیکھ رہے ہیں'' وہ آہستہ سے بولا تھا۔ ''جس پر داؤ لگاؤ گی وہی جیتے گا۔'' مگر جب لڑکی نے اس کا ہاتھ چوما تو اس نے ایک گھوڑے کا نام بتاتے ہوئے کہا۔

''شارک''۔ بعد میں جب مینا نے اپنے بستر میں ریس کی اگلی دوڑوں میں شارک کا نام تلاش کیا تو وہ موجود تھا۔ لڑکی نے وہ گھوڑا کھیلا اور مالا مال ہوگئی۔ اسکے دوسرے دن مینا نے باپ کو آگاہ کر دیا کہ اس کا گھوڑا اسے مل گیا ہے اور اب وہ اپنا اصطبل خود بنائیگی۔

مینا کو مانو سے والہانہ عشق ہو چکا تھا کیونکہ وہ اب کئی گھوڑے جیت چکی تھی۔ لیکن مانو بڑی الجھن میں تھا حسن، جوانی، ہزاروں رنگوں میں بکھری ہوئی زندگی اور اس کی سرشاری اس کے آس پاس رقصاں تھیں ایک مینا بھی اس کے پاس تھی جو کبھی دلیے کے کٹورے سے باہر نہ نکلی تھی مگر اب وہ جس قدر ردوڑ میں جیتنے والے گھوڑوں کے نام یاد کرتا تو اسے گھوڑوں کی جگہ گدھے نظر آتے جن کا نہ کوئی نمبر تھا اور نہ نام۔ لیکن جب ایک دن مانو کو بیئر کا بل خود ادا کرنا پڑا تو اس کو پتہ چلا کہ مینا کو اس خیال سے ہنسی ہو رہی تھی کہ بیئر کا رنگ کچھ بدل گیا ہے پتہ نہیں کیوں وہ سنہرا نہیں دکھائی دے رہا۔ تب اس نے مینا سے پوچھا۔

''مینا ڈیئر یہ بتاؤ یہ زندگی کیا ہے۔؟''

''گھوڑے پر لگایا گیا ایک داؤ۔'' مینا ادا سے چہک کر بولی تھی۔ مینا کا ڈاکٹر باپ کئی بار جب گھوڑے پوچھنے پر بھی مانو کو خالی دیوار تاکتے ہوئے دیکھتا رہا تو مانو کے مرض سے مایوس ہو گیا۔ انھیں دنوں اپنے دلیا کے کٹورے میں ایک بار پھر مانو کو گھوڑے کی پیٹھ پر ایک مینا بیٹھی دکھائی دی تو مانو اس سے پوچھ بیٹھا۔

''تم ایسا کرو مینا کہ مجھے کوئی گھوڑا بتاؤ''۔

''گھوڑا نہیں گھوڑی۔'' مینا چہک کر بولی ''اور اس کا نام ہے مینا۔ مینا پر لگاؤ''۔

مگر ریس کی کتاب میں مینا نام کی کوئی گھوڑی نہ تھی۔ مانو نے سوچا مینا کہیں نہ کہیں ضرور ہوگی وہ اس کو ریس کورس کے میدانوں میں ہوٹلوں کے لانوں میں تلاش کرتا رہا مگر وہ مینا تو شاید کسی کے کٹورے کے دلیے میں جا کر بیٹھ گئی تھی۔

Scanned by CamScanner

مانو ممبئی سے واپس آ گیا ہے اپنے کمرے کی اکلوتی کھڑکی پر بیٹھا ہے۔ پاس ہی میز پر اس کا دودھ بھرا گلاس بھی دھرا ہے کھڑکی کے سامنے کسی فلیٹ کے اندر اسے مینا جیسی کوئی لڑکی چلتی پھرتی آتی جاتی کہیں نظر آ جاتی ہے وہ منڈیر سے کسی کوّے کو اترتے دیکھتا ہے جو اس کے گلاس کا سارا دودھ پی کر گورا ہو جاتا ہے۔ مگر اب مانو کے دونوں ہاتھوں کی پانچوں انگلیاں ایک دوسرے سے جکڑی ہوئی ہیں۔ ہونٹوں کے کونوں سے رال بہہ رہی ہے آنکھیں ادھر ادھر گھوم کر چھت سے چپک رہی ہیں۔ پائجامے کا ایک پائنچہ پھٹ چکا ہے دوسرے کمرے میں مانو کا باپ دل ہی دل میں سسکیاں سی لے رہا ہے۔ مانو کے دونوں زانوؤں پر اس کی نوٹ بک کھلی رکھی تھی۔ وہ اس میں کچھ گن رہا تھا اور الجھ رہا تھا۔ آخر کو وہ چلایا۔

"ابا ابا مجھے بتاؤ نا گھوڑے کیوں ہار جاتے ہیں۔ کوّے دودھ کیوں پی جاتے ہیں؟"۔

باپ ناشتے کی میز پر بیٹھا کٹورے میں دلیا کھا رہا تھا باپ کو لگا کہ دلیے میں پڑے دودھ کا رنگ کالا ہے۔ وہ گھبرا کر بیوی سے دودھ کی شکایت کرنے کو اٹھا مگر یہ سوچ کر بیٹے کی آواز کی طرف چل پڑا کہ بیوی بھلا کیوں مانے گی کہ دودھ کا رنگ کالا ہے۔ باپ کھڑکی کے قریب پہنچا اور دھیرے سے بیٹے کے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیرا۔ اور اندر کے درد کو سنبھالا۔ پھر بھی اسکے دل سے ہوک سی اٹھی جو کہہ رہی تھی۔

"جو کچھ جیسا ہوتا ہے وہ ہمیشہ ویسا ہی کہاں دکھائی دیتا ہے"۔

تب تک پھر ایک بار مانو اپنی نوٹ بک پر جھکا وہ اپنے ٹوٹے ہوئے یقینوں کا شمار کر رہا تھا مگر بار بار گنتی بھول جاتا آخر کو گھبرا کر اس نے نوٹ بک کو بری طرح نوچ پھاڑ کر پھینک دیا۔

"یہ کیا کیا بیٹے"؟۔ باپ دھیرے سے بولا۔

مانو دو پل باپ کو دیکھتا رہا پھر اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ وہ بدبدایا۔

"گنتی کر رہا تھا ابا مگر یہ تو بے شمار ہیں"۔" پھر مانو آنکھوں میں دو آنسو لیے اپنے پاگل پن پر دیر تک ہنستا رہا۔

(۱۹۹۷ء)

□□□

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

ہم گریہ سر کریں گے

شائد دس یا گیارہ برس کی عمر اس وقت رہی ہوگی مگر وہاں کی کئی باتیں بار بار یاد آجاتی ہیں۔ ہمیشہ ہی سب سے پہلے وہ پتلی سی کالی سڑک تو ضرور یاد آتی ہے جس کے کنارے وہ عمارت تھی۔ سنا تھا کبھی خالو کے والد نے اس عمارت میں بہت پہلے مویشوں کا اسپتال قائم کیا تھا۔ یہ بھی یاد ہے کہ پیچھے کی جانب ایک تالاب تھا جس میں کنول بہت کھلا کرتے تھے۔ پھر وہ باریک جالیوں والے بڑے بڑے دروازے جنھیں ہاتھ سے چھوڑ دینے پر پٹ اپنے آپ بند ہو جایا کرتے تھے۔ اور جس کے ایک پٹ میں میری انگلی دب گئی تھی۔ ان دروازوں کو سہ پہر بعد مچھروں کے اندر گھس آنے کے ڈر سے کھولے جانے کی سخت ممانعت تھی۔ لوگ بتاتے تھے رات میں کبھی کبھی پڑوس کے جنگل سے شیر گھومتا گھامتا نکل آتا تھا۔ ایک رات باہر مچھر دانی میں سور ہے خانساماں کی مچھر دانی سے منہ لگائے جھانک رہا تھا۔ خانساماں کو ہمیشہ میں نے سفید کپڑوں میں ہی دیکھا تھا۔ شائد خالو کو سفید رنگ زیادہ پسند تھا۔ برآمدے میں پڑے بھاری بھاری تخت پر بچھنے والی چاندنی اور موٹے موٹے گاؤ تکیے بھی سفید براق ہوا کرتے تھے۔ خالو عام طور پر تخت پر بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے، دسترخوان پر آنے والے چینی کے برتن بھی دودھ جیسے سفید ہوتے۔ ایک دن دسترخوان پر ترتراتی ہوئی نہاری کا ڈونگا جس میں ایک طرف معمولی سا بال پڑ گیا تھا انھوں نے آنگن میں اچھال دیا تھا۔ اگرچہ میرا قیام وہاں صرف گرمیوں کی چھٹیوں بھر کے لیے ہوتا مگر مجھے پانی اُبال کر پلایا جاتا۔ خالہ بار بار کہتیں یہاں فیل پا کا مرض عام ہے۔

خانساماں ممدو کو بخار تھا، خالو کا حقہ میں نے اس رات اس لالچ میں خود بھرا کہ مجھے ان سے کہانی سننا تھی۔ حقہ تازہ کر کے جو میں خالو کے سامنے لایا تو وہ بڑی بڑی آنکھیں پھاڑے میری صورت دیکھنے لگے۔

''چلم کس نے بھری'' وہ تشویش سے بولے جس میں کچھ خفگی بھی تھی۔

''میں نے'' اپنے کارنامے کا میں نے اعلان کیا۔ اس سے پہلے کہ خالو ممدو کی

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

بیوی کی خبر لیں۔ میں نے خالو سے جھٹ وضاحت کردی کہ پٹھانی چلم بھرنے میں دیر لگاتی اور مجھے خالو کے حقہ بھرنے کے عیوض میں کہانی سننا ہے۔

خالو کی سنائی کہانیوں کے بارے میں اب مجھے یہ شک ہوتا ہے کہ خالو نے جو درجنوں کہانیاں مختلف موقعوں پر مجھے سنائی تھیں کیا ان میں سے بیشتر کہانیاں سنائے جانے کے دوران ہی گڑھی ہوئی کہانیاں تو نہ تھیں۔ شاید اس شک کی بنیاد یہ رہی ہو کہ اس رات جب انھوں نے کہانی شروع کی تو تالاب کے کنارے مینڈھکوں کے ٹرانے کی آوازیں ہمارے برآمدے میں زور زور سے آرہی تھیں۔ خالو نے وہ آوازیں سن کر کچھ سوچے بغیر کہانی یوں شروع کردی۔

''اچھا تو سنو۔ ایک تھا مینڈھک'' اسلیئے مجھے شک ہوتا ہے کہ اگر اس وقت بالفرض سیار بول رہے ہوتے تو وہ کہتے'' ایک تھا سیار'' وہ کہانی انھوں نے کن لفظوں میں سنائی تھی اسے میں جوں کا توں تو دہرانہ سکونگا اور نہ وہ انداز ہی پیدا کرسکتا ہوں۔ پھر ان کی وہ شاندار آواز، خوب بھاری اور بھری بھری سی میرے پاس کہاں ہے؟ ایسا لگتا تھا جو واقعہ ہورہا ہے وہ جیسے ہمارے سامنے ہی گزر رہا ہے۔ بہر حال وہ کہانی کچھ اس طرح شروع ہوئی تھی۔

بہت دنوں کی بات ہے کسی مینڈھک کے ماں باپ نے ایک تالاب کے کنارے رہنا شروع کیا۔ چھوٹا مینڈھک وہاں بہت خوش تھا اور اپنا پیٹ بھرنے کے لیے روز ہی گھانسوں میں چھپے چھوٹے موٹے کیڑے مکوڑے پکڑ کر کھاتا اور مگن رہتا۔ دن میں جب گرم دھوپ پھیل جاتی تو وہ چپکے سے چھلانگ لگا کر پانی میں چلا جاتا اور رات آتی تو پانی سے نکل کر ٹھنڈی ٹھنڈی اور گیلی مٹی پر آکر بیٹھتا اور اپنے ہمجولی مینڈھکوں کے ساتھ ٹرٹر کرکے دیر رات تک گاتا گاتا۔ مینڈھک کے ماں باپ بیچارے اب کچھ بوڑھے ہو چلے تھے۔ کچھ ہی دنوں میں خدا کا کرنا کچھ ایسا ہوا کہ چھوٹے مینڈھک کے اچھے دنوں پر کسی کی بری نظر پڑگئی۔ کیونکہ مینڈھک کا باپ اور اسکے ساتھ رات میں دیر تک گاتا گانے والے دوسرے مینڈھک بھی اب زیادہ تر چپ رہا کرتے تھے۔

دھیرے دھیرے مینڈھک کو ایک عجیب بات کا اندازہ ہوا۔ اسے لگا کہ جس تالاب میں وہ رہتا ہے اس کا کنارہ ہر دن کچھ دور ہوتا جاتا ہے اور تالاب کی کیچڑ لبی ہوتی

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

جاتی ہے۔ دراصل یہ اندازہ اسے اسلیئے ہوا کہ پہلے وہ جس پرانے درخت کی جڑوں میں جا کر کبھی کبھی بیٹھتا تھا وہاں سے اسے پانی میں پہنچنے کے لیے بس ایک چھلانگ لگانی پڑتی تھی۔ لیکن اب وہ تین چھلانگوں کے بعد ہی تالاب تک پہنچ پاتا۔ اسے حیرت یہ تھی کہ وہ موسم برسات کا تھا، کوئی جیٹھ بیساکھ کا زمانہ تو تھا نہیں، وہ تو تالاب کے لبالب بھرے رہنے کے دن تھے پھر تالاب دن بہ دن چھوٹا کیوں ہوتا جا رہا تھا۔ پھر تو چھوٹے مینڈھک کو بھی فکر لگ گئی۔

ایک رات چھوٹے مینڈھک کو خیال آیا کہ جس درخت کی جڑوں میں جا کر وہ بیٹھا کرتا تھا۔ وہ تو اس کا پکا دوست ہے۔ پھر اسکی عقل بھی کہیں زیادہ بڑی ہے۔ کیوں نہ اس پیڑ سے یہ اس عجیب و غریب تبدیلی کا پتہ کرے۔ ابھی وہ یہ باتیں سوچ ہی رہا تھا کہ اسکی ماں پھدک کر پاس آئی اور بولی

''بیٹا ہماری عمر تو جیسے تیسے گزر گئی، تم کو بہت دنوں جینا ہے، اسلئے تم یہ جگہ چھوڑ کر کہیں اور نکل جاؤ نہیں تو بے موت مارے جاؤ گے''۔ چھوٹا مینڈھک گھبرا گیا بولا

''ایسی کیا بات ہے؟''

''یہ بات تمھاری سمجھ میں نہ آئیگی۔ جیسا کہتی ہوں کرو، یہ جگہ چھوڑ دو''۔ یہ کہہ کر ماں کیڑے مکوڑے ڈھونڈنے چلی گئی۔ چھوٹے مینڈھک کی الجھن اور بڑھ گئی۔ وہ جلدی جلدی چھلانگیں لگا کر اس درخت کے پاس پہنچا جو اسکا پکا دوست تھا۔ مینڈھک نے دوسری کوئی بات کیئے بغیر سیدھا اپنا دکھڑا رونا شروع کیا۔

''دوست میں بہت پریشان ہوں۔ تم ہی میری مدد کرو۔''

''کیوں ایسی کیا پریشانی ہے''؟ درخت نے سوال کیا

''سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارا تالاب پیچھے کیوں بھاگ رہا ہے۔ ماں بہت گھبرائی ہوئی ہے، کہتی ہے یہ تالاب چھوڑ کر فوراً کہیں چلے جاؤ۔ مگر کیوں؟ یہ کوئی نہیں بتاتا''۔ درخت کی جڑیں اس علاقے میں بہت گہری تھیں۔ وہ وہاں دن رات کھڑے کھڑے ہر طرف کی خبر رکھتا تھا بولا

''ماں ٹھیک کہتی ہے، یہاں سے کسی دوسری ترائی میں نکل جاؤ''۔ درخت نے بھی وہی مشورہ دیا جو ماں نے دیا تھا۔ یہ سن کر چھوٹا مینڈھک بہت چکرایا۔

MD NADEEM IQBAL

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

"کیا آپ بھی مجھے اس کی وجہ نہ بتائیں گے؟"

"وجہ تو کوئی خاص نہیں ہے، بس وقت بدل رہا ہے۔" درخت نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ یہ سنکر تو مینڈھک اور بھی بھونچکا رہ گیا

"وقت بدل رہا ہے؟ کہاں بدل رہا ہے؟ سورج پہلے جیسا ہی نکلتا ہے اور ڈوبتا ہے" یہ سنکر درخت کو بڑا مزہ آیا ہنسکر بولا۔

"وہ وقت نہیں، تمھارا وقت بدل رہا ہے۔"

چھوٹے مینڈھک کو اس جواب پر اور بھی حیرت ہوئی، بلکہ اسے اپنی عقل پر رونا آ گیا۔ درخت نے جب مینڈھک کی بھیگی ہوئی آنکھیں دیکھیں تو اسکو بڑا ترس آیا، پیار سے بولا۔

"اب یہ بات تمھیں کیسے سمجھاؤں کہ اس تالاب کا پانی مشینوں سے کھینچ کر خشک کیا جا رہا ہے۔!"

"خشک کیا جا رہا ہے۔" مینڈھک اُچھل پڑا "کیا اب اس میں پانی نہیں رہے گا؟"

"نہیں یہاں بستی والے عمارت بنائیں گے۔"

"عمارت؟ کیسی عمارت؟"

"شائد امن کے زمانے میں وہ عبادت گاہ رہے گی اور جنگ کے زمانے میں اسپتال۔"

"عبارت گاہ۔" مینڈھک نے ذہن پر زور دیکر کہا "لیکن ہم تو کوئی عبادت گاہ نہیں بناتے اور عبادت بھی کرتے ہیں۔" مینڈھک نے درخت کو یاد دلایا۔

"ہاں۔ عبادت تو تم بھی کرتے ہو" درخت نے حامی بھری "مگر عبادت کا ایک ہی طریقہ نہیں۔"

یہ سن کر مینڈھک نے اپنی عقل لڑانے کی پھر کوشش کی۔

"اچھا ہوتا وہ کہیں اور عمارت بناتے، ہمیں بھی اپنا گھر نہ چھوڑنا پڑتا۔"

درخت کو مینڈھک کی بات ٹھیک لگی "کہتے تو تم ٹھیک ہی ہو" پھر لمبی سی سانس

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

لیکر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

''مگر انھیں تم یہ کیسے سمجھا سکتے ہو۔وہ جہاں جو چاہیں اور جب چاہیں بنا سکتے ہیں۔''

''ایسا کیوں۔؟''

''وہ بستی والے ہیں۔وہ بہت سی چیزیں بناتے ہیں بھئی۔''

''تو ہم انھیں سمجھائیں گے کہ وہ جو بنانا چاہیں بنائیں، لیکن ہمکو بھی بنا رہنے دیں۔''

''ہاں بات تو ٹھیک ہے۔جاؤ سمجھاؤ۔'' پھر ذرا رک کر مینڈھک کو خبردار کیا

''مگر ایک خطرہ بھی ہے۔''

''کیسا خطرہ؟''

''تم بستی میں لوگوں کے درمیان کیسے جاؤ گے؟ وہاں بہت بھیڑ ہوتی ہے۔''

''تو۔۔؟'' چھوٹے مینڈھک نے تیوریاں چڑھائیں

''کسی نے تم پر پیر رکھ دیا تو ساری آنتیں باہر نکل آئیں گی۔''

''ہاں یہ بات تو ہے۔'' مینڈھک ڈر کر بولا۔ وہ بڑے تذبذب میں پڑ گیا، درخت سے اسکی ملاقات بڑی مایوس کر دینے والی تھی مگر اسکو لگا کہ بستی میں جا کر بستی والوں کو وہ بات بھی سمجھانا بہت ضروری ہے۔آخر کو اس نے چپ چاپ اپنے دل میں یہ بات ٹھان لی کہ ایک بار سر سے کفن باندھ کر وہ چھپتا چھپاتا اور لوگوں کے پیروں سے بچتا بچاتا بستی میں جائے گا ضرور اور اپنے دل کی بات بھی ضرور کہے گا کہ انکے ایک گھر بنانے سے ہزاروں مینڈھک بے گھر ہو جائیں گے۔

کہانی ابھی اس مقام پر پہنچی ہی تھی کہ باہر عمارت کے سامنے والی پتلی سی کالی سڑک پر شور شرابے کی آواز سنائی دی، ان آوازوں سے گھر کے اندر کچھ ایسی سراسیمگی پھیل گئی کہ خالو کی کہانی کا تالاب اور تالاب کا چھوٹا مینڈھک اور مینڈھک کو مشورے دینے والا اسکا دوست، وہ درخت، سب ایک پل میں ہوا ہو گئے۔یکایک ایسا کیا ہو گیا تھا یہ تو مجھے کچھ اندازہ نہ ہوا لیکن گھر کے لوگ جلدی سے عمارت کے ایک چھوٹے سے کمرے میں

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

پہنچا دیئے گئے۔ اس کمرے کا فرش لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ اس افراتفری میں میری خالہ نے پٹھانی کی مدد لیکر اس فرش کو اوپر اٹھایا تو ایک دو ہاتھوں نے جلدی سے مدد کی۔ فرش اٹھا تو چار گہری سیڑھیوں کے بعد ایک چھوٹا سا کمرہ نمودار ہوا، گھر والے اسے غالباً گودام کہتے تھے، ممکن ہے اس میں اسپتال کے زمانے میں مویشیوں کی دوائیوں کا ذخیرہ رکھا جاتا ہو، مجھے یاد ہے ایک بلب کی عجیب مری مری اور سیلی ہوئی سی روشنی ٹمٹمار ہی تھی اس میں، وہاں رکھے سامان میں لحاف گدوں کے علاوہ اور تو میں کچھ شمار نہیں کر سکا تھا، یکا یک فرش پر چوہوں کی مینگنیاں دیکھ کر خالہ نے دانتوں تلے انگلی رکھ لی تھی اور جب انکی نظر ایک لحاف کے ابرہ پر پڑی جو جگہ جگہ سے کٹا ہوا تھا تو ماتھا ٹھونک کر رہ گئی تھیں۔ یہ تو اب یاد نہیں کہ آواز کس کی تھی، مگر اسی وقت کسی نے آواز لگائی کہ باہر برآمدے میں ممدو خانساماں لیٹے تھے۔ ممدو سنا ہے خالو کے ہمیشہ سے بڑے چہیتے تھے۔ کیونکہ ممدو کے ہاتھ کے پکے موتی پلاؤ نے سب پر اپنی دھاک بٹھا رکھی تھی۔ بہر حال جب ممدو کے باہر رہ جانے کی کسی نے آواز لگائی تو خالو غلاف میں لپٹی کوئی چیز ہاتھ میں لیے باہر کی طرف لپکے لیکن پھر کیا ہوا کچھ بتانا مشکل ہے۔ بس کسی دوران کسی لمحہ باہر سے ایک چھنا کا سا ہوا اس وقت تو یہ اندازہ نہ ہوا کہ گھر کی کسی کھڑکی کا شیشہ ٹوٹنے کی آواز تھی یا باہر سے شیشے کی کوئی چیز پھینک کر گرائے جانے کا چھنا کا۔ ''یا اللہ خیر'' خالہ کی گھٹی سی آواز تو میں نے سنی۔ میرے پاس اور کوئی کام تو تھا نہیں۔ اس کمرے میں دبکی بیٹھی عورتوں کے چہرے پڑھ رہا تھا۔ پٹھانی کا عجب عالم تھا۔ اس کا سارا دھیان عمارت کے باہر برآمدے میں تھا جہاں ممدو کے ہونے کی آواز لگائی گئی تھی۔ یکا یک اس موٹی سی چوڑے منہ اور بڑی بڑی گول آنکھوں والی پٹھانی نے کمرے کی چھت کو موٹے موٹے ہاتھوں سے اوپر اٹھانے کی دیوانہ وار کوشش کی تو عورتوں نے اسے دبوچ لیا۔ غالباً وہ باہر نکلنا چاہتی تھی۔ ویسے تو وہ ادھیڑ عمر کی رہی ہوگی مگر طاقت کے لحاظ سے اس وقت اس کی بے قراری نے اس کی آدھی عمر جیسے گھٹا دی تھی۔ ممکن ہے وہ عمارت سے باہر پھلانگ پڑنے کی بے قراری رہی ہو۔ ہم لوگ کوئی آدھے گھنٹے تو اس تہ خانے میں رہے ہونگے۔ اس موقعے پر تہ خانے میں زینہ اترتے وقت جب خالو کو میں نے دیکھا تھا تو غلاف چڑھی جو چیز ان کے ہاتھوں میں تھی اسکے بارے میں اب یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

بندوق ہی تھی اور وہ غلاف کے تکلے ہی کھولتے ہوئے آگے بڑھے تھے اور ان کا رُخ باہر کے دروازے کی طرف تھا۔ بعد میں تو یہ بھی سننے میں آیا کہ باہر شاید کئی لوگ تھے، جنھیں غالباً یہ بھی پتہ تھا کہ انھیں کیا کرنا ہے۔ وہ ان جھگیوں میں آگ لگا کر وہاں کے مکینوں کو اس زمین سے بے دخل کرنے کے بعد خالو کے گھر کی طرف آئے تھے۔ عورتوں کی کھسر پسر سے کچھ ایسا پتہ چلا تھا کہ خالو ان جھگی والوں کی پشت پناہی میں تھے اور بڑے بڑے بلڈروں کے زیر اثر کام کرنے والی مافیا کے لیڈر کو یہ شک بھی تھا کہ ان کے کسی آدمی کو خالو نے جان سے مار کر گھر کے آنگن میں دفن کر رکھا ہے۔ شور شرابا ختم ہوا تو پٹھانی سر پیٹتی باہر آئی دیکھا برآمدے میں پلنگ تو تھا مگر خانساماں ممدو کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ پلنگ پر ایک پرچہ پڑا تھا جس پر دیوناگری میں لکھا تھا ''مولانا اب کے تمھاری باری پکّی ہے۔'' اس واقعہ کے فوراً بعد مجھے خالو کے گھر سے اپنے ماں باپ کے پاس بھیج دیا گیا۔

میں دھیرے دھیرے وقت گزرنے کے ساتھ سیانا تو ہو رہا تھا مگر جو کچھ گھروں میں، محلوں میں، دفتروں اور بازاروں میں آئے دن ہو رہا تھا اس کا اثر ان لوگوں جیسا تو شائد مجھ پر نہ رہا ہوگا جو اس کو سیدھا جھیل رہے تھے۔

اپنے گھر پہنچنے کے بعد مجھے ایسا لگا تھا کہ اب شائد میرے والدین مجھے خالو کے گھر نہ بھیجیں گے۔ مگر ایک سال بھی نہ گزرا تھا کہ خالہ کے قاصدوں نے میری والدہ سے تقاضے کرنا شروع کر دیئے۔ خالہ مجھے بہت پیار کرتی تھیں۔ اسلیئے جب گرمیوں کی چھٹیاں نزدیک آنے لگیں تو اماں نے ان کے تقاضوں کو دیکھ کر ان کا دل رکھنے کی خاطر مجھے پھر ان کے پاس بھیج دیا۔ اس گھر میں یہ میری دوسری آمد تھی۔

ابھی مشکل سے پندرہ روز ہی مجھے وہاں گزرے تھے کہ ایک شام گھر میں ایک جوان عورت روتی ہوئی داخل کی گئی جس کے بدن پر خراشیں تھیں۔ اسے دیکھ کر ایک عجیب منحوس سا سناٹا سب پر چھا گیا۔ خالو کے عجیب تیور تھے۔ پتہ لگا ابا کو بھی تار دیا گیا ہے۔ ابا ہانپتے کانپتے پہنچ گئے تو رات دیر تک خالو تنہائی میں ان سے باتیں کرتے رہے۔ باتوں میں تیز آواز میں ابا کا یہ جملہ اندر کے برآمدے تک پہنچ گیا

''تم کیا خدائی فوجدار ہو، اپنے کام سے کام رکھو''۔ جواب میں اتنی ہی اونچی

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

آواز میں خالو کا جملہ بھی باہر گرا۔

''اور اس مفلس اور بے کس لڑکی کو بھیڑیئے کے آگے ڈال جانے دوں ۔آپ ایس. پی. سے بات کیجئے''۔ کچھ دیر بعد ابا کمرے سے نکلے اور باہر چلے گئے ۔خالہ سے معلوم ہوا کہ کسی پولیس والے سے ملنے گئے ہیں۔ابا دو تین گھنٹے بعد لوٹے تو ان کا منہ لٹکا ہوا تھا، وہ کسی سے بات نہیں کررہے تھے، جب خالو کے کمرے سے مہمان چلے گئے تو ابا ان سے تنہائی میں پھر ملے۔یہ تو پتہ نہیں کیا باتیں ہوئیں باہر آکر وہ خالہ سے بولے۔

''میں گیارہ بجے کی گاڑی سے ہی واپس جارہا ہوں۔'' خالہ بے چاری دم بخود تھیں، کچھ نہ بولیں مگر ان کی آنکھیں سوالی تھیں۔ چلتے وقت ابا نے ان سے بس اتنا ہی کہا

''اپنے میاں کو سمجھایئے، آنکھیں بند رکھیں اور نیتا گیری کا چکر چھوڑ دیں''۔

دو چار روز بڑی گھٹن رہی پھر شب و روز کچھ معمول پر آگئے۔اس درمیان میرے کانوں میں جو باتیں پڑیں ان سے یہ اندازہ ہی لگ سکا کہ خالو کی آرا مشین پر کوئی مزدور کام کرتا تھا، اس کی بیوہ سالی کی جوان لڑکی تھی بیوہ کی فریاد پر خالو اس لڑکی کو اپنی پناہ میں لے آئے تھے۔اس کی فریاد میں جو ملوث تھا وہ ابا کے محکمہ پولیس سے تعلق رکھتا تھا۔اس واقعے کو چودہ پندرہ دن گزر گئے تھے اور میری واپسی دو ہی چار روز میں ہونے کو تھی۔ صبح کا وقت تھا خالہ ناشتے پر خربوزے کاٹ رہی تھیں کہ باہر کے دروازے پر کچھ آہٹیں ہوئیں پھر کچھ ہلچل بڑھ گئی، خالو باہر ہی تھے۔خالہ نہیں اٹھیں، کچھ دیر بعد ہوا کے جھکڑ کی طرح خالو اندر آئے، غضب ناک تیوروں سے عورتوں کو پردہ کرنے کو کہا اور خود آنگن میں جا کر وہ دروازہ کھول دیا جو عمارت کے باہر کھلتا تھا۔دروازے کا کھلنا تھا کہ دو پولیس والے کچھ مزدوروں کے ساتھ جنکے کندھوں پر پھاوڑے اور کدالیں تھیں آنگن میں آکھڑے ہوئے۔آنگن کے دا ہنی جانب جدھر ٹیوب ویل لگا تھا، رات کی رانی کا ایک مختصر سا پیڑ تھا۔ایک پولیس والے نے وہاں سے کچھ فاصلے پر کھڑے ہو کر ادھر اُدھر کا جائزہ لیا۔ پھر پیر سے زمین کو تھپتھپایا، دوسرے نے کچھ الگ ہٹ کر یہی عمل دہرایا اتنے میں ایک وردی والا اور آگیا، پہلے آئے پولیس والوں نے اسے سلام مارا، آنے والے نے خندہ پیشانی سے خالو سے ہاتھ ملایا، خالو کے برتاؤ میں کوئی گرم جوشی نہ تھی پھر بھی انھوں نے خالی کرسی کی جانب بیٹھنے کا

Scanned by CamScanner

اشارہ کیا مگر وہ بیٹھا نہیں، آنگن میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ آ گیا۔ مزدور ایک کونے میں زمین پر بیٹھ گئے تھے، ایک نے کھانستے ہوئے بیڑی جلالی تھی، تینوں وردی والے آپس میں باتیں کر رہے تھے، نیا آنے والا پورے آنگن کو آنکھوں میں بھر لینے کی جستجو میں لگا تھا، اتنے میں ان میں سے ایک نے پانی مانگا، پٹھانی باقاعدہ گلاسوں میں پانی لائی، دھوپ میں ابھی تیزی نہیں چمکی تھی۔ تھوڑی دیر کی چلت پھرت اور منہ ہی منہ میں باتوں کے بعد دیر سے آنے والے نے مزدوروں کو اشارہ کیا، وہ آئے تو ایک خطے کی نشاندہی پیر کے اشارے سے کی گئی، دونوں مزدور اس جگہ تھوڑے فاصلے سے ڈٹ گئے اور کدال چلانے لگے۔

مزدوروں نے اپنا کام شروع کر دیا تو بعد میں آنے والا تھوڑی دیر ٹھہر کر وہاں سے چلا گیا، پاس ہی برآمدے میں پڑی کرسیوں پر دونوں پولیس والے بیٹھ گئے، آنگن میں اینٹوں کا فرش تھا، اینٹیں ہٹنے کے بعد مٹی نرم تھی، تین گھنٹوں میں مزدوروں نے قبر جیسا لمبا چوڑا اور گہرا گڑھا کھود ڈالا، گہرائی سے نکلی مٹی معائنے کے لیے کرسی پر بیٹھے پولیس والوں کو دکھائی گئی، جن کی سمجھ میں پوری طرح شائد نہ آیا کہ وہ اس کا کیا کریں۔ انھوں نے دو ایک بار اسے الٹ پلٹ کر پھینک دیا اور اپنے ہاتھ دھلوائے۔ مزدوروں نے پورے دن میں اس طرح تین گڑھے کھود ڈالے، خالو بار بار اندر جاتے اور پھر واپس برآمدے میں آتے تھے۔ ایک بار وہ جل کر ان میں سے ایک سے مخاطب ہوئے تھے، مخاطب کیا ہوئے تھے بس بڑ بڑائے تھے اتنی صاف آواز میں کہ وہ دونوں سن لیں۔

''اچھا ہے۔ نا تک بہت اچھا ہے''۔ مگر ان دونوں نے کوئی توجہ نہ دی تھی بلکہ مزدور کو گالی دے کر تیز ہاتھ چلانے کی ہدایت کی تھی۔

وہ سب کیوں ہوا تھا اس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔ جو باتیں میرے کانوں تک پہنچیں وہ بس اتنی ہی تھیں کہ کوئی مخبری ہوئی تھی، غالباً وہاں کچھ دفن ہونے کا شبہ تھا، کہا تو یہ بھی گیا کہ کسی لاش کا معاملہ ہے۔ مگر حقیقت کیا تھی وہ مجھ پر نہ کھلی۔ چھٹیاں ختم ہوئیں اور میں گھر چلا آیا۔ ابا کو اس واقعہ کی خبر مل ہی چکی تھی۔ کسی دن انھوں نے اماں سے کسی اور بات کو لیکر کہا تھا

''اپنے بہنوئی کی درگت دیکھ تو رہی ہو، کچھ نہیں تو آنگن کھدوا دیا گیا۔ اسی کو کہتے

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

ہیں شیطان مارتا نہیں ہلکان کرتا ہے۔" اس واقعے کے بعد سے پھر میرا خالو کے گھر جانا نہ ہوا، دیکھتے ہی دیکھتے آٹھ برس گزر گئے، اتنے لمبے عرصے میں خالو کو شائد سات برس پہلے تھوڑی دیر کے لیے دیکھا تھا، وہ چچاجان کی بیٹی کی شادی میں آئے تھے، اس کے بعد خاندان میں جو بھی تقریبیں ہوئیں ان میں خالو کی شرکت نہ ہوئی، خالہ البتہ اس دوران دو تین بار آئیں تھیں۔ یہ آٹھ برس اب لگتا ہے کہ بہت ہوتے ہیں، جب یہ خیال آتا ہے کہ یہ برس میری خالہ پر کیسے گزرے ہونگے تو بڑی کوفت ہوتی ہے۔ گھر والا جب کوئی آسیب زدہ وجود بن جائے تو گھر کے مکینوں پر کیا گزرتی ہوگی۔ خالہ والدہ کو خط لکھتی رہتی تھیں۔ ایک بار جاڑے کے موسم میں باجرے کی میٹھی ٹکیاں بھی بنا کر کسی کے ہاتھ بھیجی تھیں۔ انھیں دنوں کے ایک خط میں، بہن کو لکھا تھا " اگر گھر بھوت خانہ ہو جائے تو پردے دار عورت گھٹ کر مرجاتی ہے۔ جو فرض ہے وہ مرتے دم تک ادا کرونگی، اس کے راز وہی جانتا ہے، اب سوچتی ہوں مزاروں پر دعائیں کیوں نہ قبول ہوئیں وہ جو کرتا ہے ٹھیک ہی کرتا ہے گود بھر جاتی تو آج کیا ہوتا اپنے ہی لخت جگر کو دیکھ دیکھ کر کُڑھتی۔ ایک بلی پالی ہے، موئی چپتا نے لحاف میں گھس کر سوتی ہے۔ مگر تمھارے بہنوئی کو اکیلے پن نے کبھی نہ ستایا، کہتے ہیں اکیلا کوئی نہیں ہوتا، اکیلا کر دیا جاتا ہے۔ نکل کر دیکھو کتنے لوگ ساتھ ہیں۔ ڈیوڑھی میں کیسے پھٹے حال چہرے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ جو بک چکا اس کا شمار نہیں، جو بچ رہا ہے اسے انگلیوں پر گن لو، اوروں کا گریباں سیتے رہے اپنا ہی گریباں بھول گئے۔" خالہ کے اس خط کو بھی آئے ہوئے کئی برس گزر گئے تھے۔ بس اچانک ایک دن خالو ہمارے گھر آ گئے، مگر میرا خیال غلط تھا وہ خود نہیں آئے تھے۔ تب میں یقیناً بیس برس کا ہو ہی چکا تھا۔ یونیورسٹی میں تھا۔ جب اچانک اپنے گھر پر خالو کو دیکھا تو سکتے میں رہ گیا۔ انکا وہ بھرا بھرا چہرہ سُت گیا تھا، بدن پر کھال کے پیچھے ہڈیاں نمایاں ہوگئی تھیں، ان کی گدّی کی کھال جو سر اور کندھوں کے درمیان مضبوطی سے کھچی رہتی تھی اندر کو پچک گئی تھی اور گہرا سا گڑھا پڑ گیا تھا۔ وہاں چپکے ہوئے چند مرجھائے بال اب سفید ہو گئے تھے، حالانکہ اس وقت ان کی عمر پچاس پچپن سے زیادہ نہ رہی ہوگی، ملاقات ہوئی تو بات کرنے کے لیے کوئی موضوع ہی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ پتہ لگا انھیں ابا لیکر آئے ہیں۔ انھیں سے معلوم ہوا کہ وہ کچھ بیمار ہیں۔ خالو کو دیکھ کر

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

حال کے برسوں کے کچھ اور واقعات بھی یاد آئے، مگر انھیں یاد کر کے دُکھ ہوتا ہے۔ اس وقت تو خالو کے اتنے قریب ہو جانے کی کچھ عجب سی حیرت تھی، پہلے ہی روز رات کے کھانے کے بعد مجھے خیال آیا کہ خالو کے لیے اس وقت حقہ بھرا جاتا تھا، لیکن ہمارے گھر میں حقہ نہ تھا، جب وہ بستر پر آئے تو میں نے ان سے دریافت کیا

''کیا آپکا حقہ ساتھ نہیں آیا ہے؟''

''حقہ تو اب ہم نہیں پیتے''۔

''کیوں؟'' میں نے پوچھا

''بس چھوٹ ہی گیا'' دھیرے سے بولے'' جہاں اور بہت کچھ چھوٹا وہ بھی چھوٹ گیا''۔ پھر انھوں نے دھیرے سے موٹے کپڑے کے ایک معمولی کرتے کی داہنی جیب میں ہاتھ ڈالا، ہاتھ باہر آیا تو اس میں ایک بیڑی کا بنڈل اور ماچس تھی۔ مجھے حقہ یاد آیا ہی تھا کہ اسکے ساتھ وہ بڑا سا گھر، وہ آنگن، تالاب اور کالی سی سڑک سب آنکھوں کے سامنے گھوم گئے۔ پھر تالاب کا خیال آتے ہی اچانک مینڈھک کی وہ کہانی بھی یاد آ گئی جو کہیں درمیان سے چھوٹ گئی تھی۔ سوچا خالو کو اس کہانی کی یاد دلاؤں شائد اسی بہانے کچھ باتیں چل پڑیں۔ اسلیئے جھٹ سے بولا

''خالو آپ کو یاد ہے؟ ایک بار آپ ایک مینڈھک کی کہانی سنا رہے تھے''

''مینڈھک کی کہانی''؟ وہ چونکے'' ہاں کچھ کہانیاں تو یاد رہ جاتی ہیں'' وہ لمبی سی ٹھنڈی سانس لے کر بولے، گردن جھکائی، بیڑی بجھ گئی تھی، دوسری تیلی جلائی تو میں نے التجا کی

''خالو وہ کہانی سنا دیجئے۔ شروع سے نہیں آگے سے۔''

''بھئی پھر کبھی سن لینا'' انھوں نے ٹالنا چاہا۔ مگر اصرار پر نیم رضامند ہوتے ہوئے لگے تو میں نے جلدی سے یاد دلایا

''جہاں مینڈھک رہتا تھا اس تالاب کو سکھا کر وہاں کیا بنایا جانے والا تھا؟''

''بڑے لوگ عمارت بنانا چاہتے تھے۔''

''ہاں اسکے بعد کیا ہوا؟''

Scanned by CamScanner

انھوں نے کہانی شروع کی تو نہ آواز میں وہ دم خم تھا نہ اتار چڑھاؤ، ایسا لگتا تھا کہ وہ میری خوشی پوری کرنے کے لیے ہی سنا رہے ہیں، چند جملوں کے بعد انھیں ٹھہر ٹھہر کر اپنی سانس بھی کچھ قابو میں کرنا پڑتی تھی، لیکن اس بار میں نے ان کی زبان کا خاصہ لطف لیا۔ جو پہلی بار ممکن نہ تھا کیونکہ اب میں خاصہ سمجھدار ہو چکا تھا۔ اس بار خالو کا بیان یوں تھا۔

''مینڈھک نے بستی کے لوگوں سے ملاقات کا قصد کیا، انھیں سمجھانے کا ارادہ کیا، درخت نے اسے بستی کے خطروں سے آگاہ کیا پھر بھی مینڈھک نے اس کی بات نہ مانی اور ایک رات کودتا پھاندتا پہنچ گیا بستی میں۔ قریب ہی ایک سنسان سی عمارت اس کو نظر آئی، مینڈھک عمارت کی ایک نالی میں گھس گیا، نالی پار کی تو دیکھا ایک کشادہ فرش پر کچھ مرد اور عورتیں کسی کام میں منہمک ہیں۔ ایک عورت کسی بچے کو چھاتی سے دودھ بھی پلاتی جا رہی تھی اور کام بھی کرتی جا رہی تھی۔ فرش پر عجب سے رنگوں کے سفوف کے ڈھیر پڑے تھے۔ اسکے علاوہ سُتلی کے بنڈل، پرانی کیلیں، شیشوں کے ٹکڑے، پرانے زنگ آلود لوہے کے ٹکڑوں کا ڈھیر لگا تھا۔ ایک اجنبی سی بو ہر طرف پھیلی تھی۔ ایک طرف دو عورتیں گولوں کی شکل جیسے سامان کو فرش سے اٹھا کر تھیلوں میں رکھ رہی تھیں۔

''کتنا مال تیار ہوا؟'' ایک بوڑھے آدمی نے اپنے ساتھی سے پکار کر پوچھا

''آج بیالیس تیار ہوئے ہیں۔'' کسی نے جواب دیا

''تم لوگ ہاتھ بہت ڈھیلے چلاتے ہو'' بوڑھے نے غصہ کیا

''جلدی کا کام نہیں۔ پیٹ پالنے کو یہ جوکھم اٹھاتا ہے بابو''۔ کوئی کالا سا آدمی آنکھیں نکال کر بولا۔

''ارے جو کام جانتا ہے وہ ایک دن میں سو بناتا ہے'' بوڑھے کی بات پر کالے آدمی کو غصہ آ گیا۔ تو وہ کالا آدمی اور بپھر گیا۔ بولا

''اے۔ بڑ بڑ کائے کو کرتا۔ یہ سالا سارا کا سارا ایک ساتھ چل جائے نا تو پورا محلہ خلاص ہو جانے کا گارنٹی اپن لیتا ہے۔''

مینڈھک سے رہا نہ گیا، سوچا اس بوڑھے آدمی ہی سے پہلے بات کی جائے، یہ سوچ کر اس نے بوڑھے آدمی کی جانب چھلانگ لگائی، بوڑھے نے مینڈھک کو دیکھا تو

Scanned by CamScanner

اُچھل پڑا

"ارے یہ سالا کدھر سے آگیا۔ لات مار کر باہر کرو"۔ ایک لڑکا چپل اٹھا کر مینڈھک پر لپکا، لڑکے کے تیور دیکھ کر مینڈھک پناہ کے لیے ادھر اُدھر جست مارنے لگا، قریب تھا کہ وہ لڑکے کی چپل کا شکار ہو جاتا کہ ایک چھلانگ اسنے ایسی بھری کہ دروازے کے راستے عمارت کے باہر اندھیرے میں جا گرا۔ پھر تو جان بچانے کی خاطر وہ چھلانگیں بھریں کہ سیدھا اپنے دوست کی جڑوں میں ہی جا کر دم لیا۔ صبح ہوئی تو مینڈھک نے درخت سے سارا احوال بستی میں اپنے سفر کا بیان کیا اور یہ بھی بتایا کہ کس طرح وہ اپنی جان بچا کر بھاگا تھا۔ جب وہ تفصیل سے وہاں سنی گئی باتیں درخت کو بتا چکا تو درخت نے سمجھایا

"تم پہلی ہی بار بہت خطرناک جگہ پہنچ گئے تھے۔ وہاں مارنے کا سامان بنتا ہے"

"مارنے کا سامان؟" مینڈھک حیرت سے بولا" کیوں؟"

"کیونکہ انھیں خود جینے کے لیے شائد دوسروں کو مارنا پڑتا ہے"۔

"لیکن ہم کسی کو نہیں مارتے، بس پیٹ بھرنے کے لیے مارتے ہیں"۔ مینڈھک نے جرح کی تو پیڑ کو ہنسی آ گئی۔ بولا

"ان کا پیٹ اس زمین سے بھی بڑا ہے"۔ یہ سن کر مینڈھک بہت چکرایا تو درخت نے پھر اسے صلاح دی۔

"تمھاری ماں جیسا کہتی ہے ویسا کرو، جلد ہی یہ جگہ چھوڑ دو۔" جواب میں مینڈھک پہلے تو اسے ٹکر ٹکر دیکھتا رہا پھر ٹھنڈی سانس لے کر بولا

"تم کتنے خوش قسمت ہو جو ایک جگہ آرام سے کھڑے تو ہو"

"خوش قسمت تو ہوں مگر بس کل تک کے لیے"

"کل تک کے لیے کیوں؟" مینڈھک نے گھبرا کر سوال کیا

"بستی والے صبح ہی باتیں کر رہے تھے، پرسوں وہ کلہاڑی چلا کر مجھے گرا دیں گے"

"کیا کہا؟ تم کو گرا دیں گے، تم ایسا کرو کہ آج ہی رات یہاں سے کہیں اور نکل جاؤ"۔ یہ سن کر پیڑ کا چہرہ مرجھا گیا، اداسی سے بولا

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

''افسوس کے میرے پاس پیر نہیں ہیں۔اب تمھی بتاؤ میں خوش قسمت ہوں کہ تم؟'' درخت کی بات سن کر مینڈھک کے دل کو دھکا لگا۔

ایک دن بعد مینڈھک نے دیکھا کہ وہ لحیم شحیم درخت جس کی جڑوں میں وہ بیٹھا تھا اور جس سے اس کو بڑی محبت تھی زمین پر کٹا پڑا تھا۔پیڑ کی ایسی دردناک موت دیکھ کر مینڈھک کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور بستی والوں کے لیے اسکے دل میں شدید غم وغصہ بھر گیا۔ اس وقت تک اس مینڈھک کے بہت سے ہجولی وہ جگہ چھوڑ کر جا چکے تھے ۔ مینڈھک نے وہ ساری رات بستی کی جانب منہ کر کے اور اسے گھور گھور کر پیچ وتاب کھاتے گزاردی۔اس رات کی صبح اس نے تالاب کے بچے کھچے پانی کے کنارے ایک جوان اور چست گھوڑے کو پانی پیتے ہوئے دیکھا، گھوڑا پھرتیلا اور طاقتور تھا، مینڈھک لپک کر کسی خیال سے اس کی جانب بڑھا پھر مخاطب ہوا

'' یہ پانی تو بس دو دن کی بہار ہے، پھر گھوڑے میاں پیاسے مروگے'' گھوڑے کو مینڈھک کی یہ بدکلامی اچھی نہ لگی، تیوریاں چڑھائیں اور خفگی سے ہنہنایا تو مینڈھک نے پھر چوٹ ماری

'' لگتا ہے بس دیکھنے بھر کا ڈیل ڈول ہے تمھارا، ہم تو تب جانیں کہ اس تالاب کو سکھانے والوں کو دولتیاں مار کر ٹھکانے لگا دو''

'' کیا؟ تالاب کون سکھا رہا ہے''۔گھوڑے نے تیور بدل کر یوں سوال کیا کہ مینڈھک خوش ہو گیا

'' وہ رہے۔وہ بستی والے سکھا رہے ہیں'' مینڈھک نے بستی کی جانب اشارہ کیا، گھوڑے نے ایک بار بستی کی طرف گردن گھما کر نظر کی اور پھر گردن جھکا کر پانی پینے میں لگ گیا۔مینڈھک کو امید تھی کہ چست اور تندرست گھوڑا جس کی ٹاپوں سے زمین کانپتی تھی غالبًا سیدھا بستی پر چڑھائی کر دیگا، لیکن اس کو اس طرح گردن جھکا کر پانی پیتے دیکھا تو کچھ مایوس سا ہو گیا، پھر پانی پی چکنے کا انتظار کرنے لگا۔ جب گھوڑا پانی پی چکا تو مینڈھک نے چٹکی لی

'' کیا ارادہ ہے؟ پیاسے مروگے یا انھیں للکاروگے؟''

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

''للکارنے کی کیا ضرورت ہے'' گھوڑے نے اطمینان سے جواب دیا ''ہم تو جہاں پانی ہوتا ہے وہاں سرپٹ پہنچ جاتے ہیں''۔ یہ جواب سن کر مینڈھک کی مایوسی کچھ اور بڑھ گئی، جل کر بولا

''ڈر گئے نا؟''

''ڈرتے تو نہیں ہیں''۔ گھوڑا کچھ سوچ کر بولا ''بس اپنے چچا کا انجام دیکھ کر تھوڑی احتیاط کرتے ہیں''۔

''چچا کا انجام؟''

''ہاں''، ایک بار بستی والے ان کی ادائیں دیکھ کر انھیں پکڑ کر لے گئے تھے'' گھوڑے نے بتایا، ''برسوں بعد جب ان کو چھوڑا تو ان کی کھال ہڈیوں سے لگ گئی تھی، ایک پیر سے بری طرح لنگڑا رہے تھے، جسم پر بھی چابکوں کے ہزاروں نشان تھے اور جبڑوں سے خون رس رہا تھا''۔ یہ سن کر مینڈھک کی ساری امیدوں کے محل ڈھا گئے اور دل بیٹھ گیا۔ نڈھال ہو کر بولا

''تو کیا کوئی ایسا نہیں جو ان بستی والوں کا صفایا کر سکے؟''

''صفایا؟ گھوڑا ذہن پر زور دیتے ہوئے بڑبڑایا۔ انھیں خود ان کے سوا کوئی اور نہیں مار سکتا۔'' یہ کہہ کر گھوڑے نے قدم پیچھے کیے اور ہوا ہو گیا۔ اسکے جاتے ہی ایک ہاتھی بھی بھولا بھٹکا ادھر آ گیا، پانی دیکھا تو پینے لگا، مینڈھک نے ہاتھی کو سلام کیا اور اس سے گھوڑے کی بات کی تصدیق چاہی۔ پوچھا

''ہاتھی میاں، کیا یہ بات درست ہے کہ ان بستی والوں کو وہی مار سکتا ہے جو انکا جیسا ہی ہو'' ہاتھی بولا

''بیشک۔ بزرگوں کی کہاوت ہے کہ زہر کو زہر ہی مارتا ہے''۔

کہتے ہیں کہ اس تالاب کو سوکھ کر پتھر ہو جانے میں جو بھی وقت لگا ہو وہ مینڈھک اس جگہ کو چھوڑ کر نہ گیا۔ وہ ہر روز سارے دن چلچلاتی دھوپ میں آسمان کی طرف سر اٹھا کر ایک دردانگیز فغاں میں مصروف رہتا۔ وہ گڑگڑاتا ''میرے مالک، مجھے بار بار ان کا جیسا بنا کہ انھیں وہی ختم کریگا جو ان کا جیسا ہو.........جو ان کا جیسا ہو''۔ سنا ہے کہ جب تالاب کی

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

اس خشک زمین کو برابر کرنے کے لیے مزدور پہنچے تو انھیں وہاں ایک ایسا مینڈھک ملا جو شاید آسمان کی جانب جست مارنے کی حالت میں اپنے پیر آگے کیے تیار بیٹھا تھا مگر زندہ نہ تھا۔ جسم سوکھ کر چمڑا ہو چکا تھا لیکن دونوں دیدے کھلے ہوئے تھے اور آسمان کی جانب تاک رہے تھے۔

کہانی ختم ہو چکی تھی۔ خالو کھانستے ہوئے چارپائی پر یہ کہہ کر لیٹ گئے تھے

"بھئی اب نیند آ رہی ہے۔ ایک گلاس پانی سرہانے رکھ دینا"۔

دوسرے دن میری والدہ ایک کوٹھری میں دوپٹے سے اپنے آنسو پونچھ رہی تھیں اور والد ان کے قریب بیٹھے چپکے چپکے کچھ باتیں کر رہے تھے۔ وہ تھوڑی دیر پہلے ہی خالو کو کسی ڈاکٹر کو دکھا کر لائے تھے کیونکہ رات میں ان کی طبیعت اچانک بہت بگڑ گئی تھی۔ میں تو خالہ کی بیماریوں کا ٹھیک حال نہیں جانتا ہاں ایسا دو ایک بار ضرور ہوا کہ میری والدہ کو بہن کی خبر گیری کے لیے جلدی جلدی سامان باندھ بوندھ کر اپنے مائکے بھاگنا پڑا تھا، کیونکہ کچھ عرصے کے لیے وہ سسرال سے وہاں آ گئی تھیں۔ لیکن افاقہ کے بعد پھر سسرال چلی آئی تھیں۔ ایک بار کچھ ایسا بھی سننے کو ملا کہ والدہ کے قصبے میں خالہ کے قیام کے دوران رات کے اندھیرے میں چہرہ چھپا کر کوئی ایسا آدمی خالہ سے ملنے آتا تھا جو انھیں دوائیں وغیرہ پہنچا دیا کرتا تھا۔ کسی کا خیال یہ بھی تھا کہ وہ خود خالو ہی تھے جسے تسلیم کرنا کم سے کم میرے لیے بہت دشوار تھا۔

پٹھانی بتاتی تھی کہ میاں کے غائب ہونے کے بعد باہر کے بہت سے کام خالو کے ایک پرانے دوست کرتے تھے۔ پٹھانی خالو کو میاں کہتی تھی۔ اسنے اماں سے بتایا تھا کہ میاں خالہ کے سرہانے رات کی رانی کے پھول ہر صبح ان کے پنج سورہ کی کتاب کے اوپر رکھ دیا کرتے تھے۔ جنھیں خالہ فجر پڑھتے وقت جانماز کے ایک طرف رکھ دیتی تھیں۔ ان کا بس نہ تھا کہ ان پھولوں پر ہی سجدہ کر لیتیں۔ خالو کی روپوشی کے دنوں میں خالہ کو رات کی رانی کی مہک اچھی نہ لگتی تھی، کہتی تھیں اس بدنصیب پودے کی جڑ میں تیزاب ڈال دو، یہ کیوں کھلتا ہے۔ پٹھانی نے یہ بھی رو کر اماں سے بتایا تھا کہ جس دن پولیس نے اماں کے مائکے والے گھر پہنچ کر تلاشی لی تھی اور گھر سے بہت سے چھاپے ہوئے کاغذات گٹھری میں باندھ کر لے گئی تھی اس دن

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

اماں کی چہیتی بلی کے بچے کو آوارہ کتوں نے بھنبھوڑ کھایا تھا، اس بچے میں اپنے زخم چاٹنے کی بھی سکت نہ تھی، روتا تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے، بلی کے بچے کا ڈراؤنا سا رونا اور پولیس والوں کا آ آ کر الٹے سیدھے سوالات کرنا اور جس پریس میں کاغذات چھپے تھے اس چھاپے خانے کے بارے میں پوچھنا، پھر ایسی الجھن اور بیزاری میں رات کی رانی کی پھیلی ہوئی خوشبو نے خالہ پر شائد غشی سی طاری کر دی تھی، وہ بار بار آنکھیں کھول کر دروازے پر کان لگاتیں، خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتیں، دھیرے سے بڑبڑاتیں "لوٹ آؤ۔ تم جان بھی دے دو گے تو بھی دنیا کا یہ کارخانہ نہ بدلے گا۔" پولیس تو آتی رہی مگر خالو نہ آئے، جب عورتیں خالہ کی میت نہلا رہی تھیں تب بھی خالو گھر میں نہ تھے، جب قبر میں اتاری گئیں تب بھی خالو نہیں پہنچے۔ لیکن جب لوگ تدفین کے بعد چلے گئے تو کوئی جھاڑیوں سے نکل کر ان کی قبر پر چپکے سے رات کی رانی کے پھولوں کا ایک ڈھیر رکھ گیا تھا۔

اتنا تو مجھے اب خیال آتا ہے کہ ایک بار ڈاک سے ایک پوسٹ کارڈ ایسا آیا تھا جس کی عبارت اردو میں تھی اور جس پر ایک مہر بھی لگی تھی۔ مہر پر سینٹرل جیل تو پڑھنے میں آرہا تھا مگر جگہ کا نام صاف نہ تھا۔ میں نے خالو کے ہاتھ کی جو تحریریں دیکھی تھیں اس سے شک تو ہوا تھا کہ شائد وہ خالو کے ہاتھ کا لکھا جیل سے بھیجا گیا کوئی خط تھا۔ خالو کے گھر آنے کے بعد کمرے میں ابا اور خالو کی باتیں ہو رہی تھیں وہ ان سے کہہ رہے تھے "قدرت جو کرتی ہے شائد اچھا ہی کرتی ہے، اگر تمھارے اولاد ہوتی تو وہ بھی تمھاری حرکتوں پر آٹھ آٹھ آنسو رو رہی ہوتی" اس کا خالو نے جواب یہ دیا "یہ کام قدرت نے نہیں کیا ہے میری بیوی نے کیا ہے۔ کئی حمل ٹھہرے، اسنے گرا دیئے۔"

"کیا؟۔ یہ تم کیا کہہ رہے ہو"۔ ابا بھونچکا ہو کر بولے "مرحومہ نے یہ بات کبھی نہیں بتائی"۔

"مرحومہ یہ کس کس سے کہتی کہ میری پہلے ہی سے سینکڑوں اولادیں تھیں۔"

"یہ تم کیا بک رہے ہو"۔ ابا غصے میں چیخے۔ جواب میں کچھ دیر خاموشی رہی پھر خالو کی بھرّائی سی آواز سنائی دی جو کہہ رہی تھی۔

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

آزردہ خاطروں سے کیا فائدہ سخن کا
تم لفظ سر کرو گے ہم گریہ سر کرینگے

پھر مجھے اس بات کی فکر لگ گئی کہ آخر گریہ کس طرح سر کیا جاتا ہے تو دوستوں نے بتایا کہ دنیا میں تین طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو ظلم کرتے ہیں، دوسرے وہ جو ظلم سہتے ہیں اور تیسرے وہ جو ظلم کے خلاف احتجاج کر کے زندگی بھر روتے ہیں۔ شام کو اماں نے مجھے کچھ پیسے دیئے اور کہا کہ میں بیڑی کا بنڈل اور ماچس خرید کر خالو کو دیدوں۔ جب میں خالو کو بیڑی کا بنڈل اور ماچس دینے اندر پہنچا تو یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ وہ ابھی جاگ رہے تھے۔ بیڑی کا بنڈل اور ماچس انکے سرہانے رکھتے ہوئے میں نے دھیرے سے پوچھ ہی لیا۔

''خالو، کیا واقعی وہ فریاد مینڈھک نے ہی کی تھی؟ جس کی کہانی آپ نے مجھے سنائی تھی یا پھر وہ آپ کی اپنی فریاد تھی۔'' سوال سن کر بھی غالبًا انھوں نے جواب ٹالنا چاہا اور کہانی والے مینڈھک کے ساکت دیدوں کی نقل کرتے ہوئے چھت کو دیکھتے رہے۔ پلک جھپکائے بغیر بس ایک ہی جانب وہ لگاتار دیکھ کر گریہ سر کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر میرا خیال غلط نکلا۔ وہ جاگ نہیں رہے تھے۔ اور گریہ کب کا سر ہو چکا تھا۔

(نظر ثانی۔ نومبر ۲۰۰۲ء)

□□□

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

سوراخ

میں باتھ روم میں تھا، ڈاکٹر احمد میرے باہری کمرے میں جو میرا کلینک بھی تھا میرا انتظار کررہے تھے۔ خالی بیٹھے بیٹھے انہیں میری میز پر وہ نوٹ بک رکھی دکھائی دی جس پر میں اپنے ذہن میں کسی کہانی کو مہمان رکھنے کے دوران طرح طرح کے خیالات کو یادداشت کے طور پر لکھ لیا کرتا تھا۔ بہ ظاہر میرے ان نوٹس میں کوئی ربط ہونا ضروری نہ تھا، کبھی کبھی وہ اتنے مختصر ہوتے کہ پڑھنے والا ان سے شاید ہی کوئی مطلب نکال پاتا لیکن میں جانتا تھا کہ میں نے وہ سطریں کیوں لکھی ہیں۔ مثلاً جب ڈاکٹر احمد نے اس چھوٹی سی نوٹ بک کے پہلے صفحے کو کھولا ہوگا تو اس پر میرے ہاتھ کی یہ تحریر پڑھی ہوگی۔

○

واقعہ تو بہت بھرپور ہے لیکن محض واقعہ تو کہانی نہیں ہوتا۔

گوری شنکر کوئی دو برس سے میرے گھر پر روز صبح اخبار ڈال رہا تھا۔ لیکن میں نے اسے مشکل سے دو چار بار ہی دیکھا ہوگا۔ بیس بائیس کا سن رہا ہوگا، دبلا پتلا زرد سا رنگ۔ وہ تو میری ماں نے ضد کی تھی۔ کمبخت کیسی اذیت میں گرفتار کر گیا، اب ہر دو پل بعد سامنے آکر کھڑا ہو جاتا ہے۔

○

میری عادت ہے کہ ایک بار میں جتنا خیال میرے ذہن میں آتا ہے بس اتنے کاغذ پر ہی لکھتا ہوں اور صفحے کی باقی جگہ خالی چھوڑ دیتا ہوں اور اگلی بار دوسرا صفحہ استعمال کرتا ہوں۔ دراصل یہ میں اس لئے کرتا ہوں کہ ایک خاص لمحے میں ابتدائی طور پر ذہن میں آنے والے اس خیال کا اپنا وجود قائم رہے اور وہ بعد میں آنے والے خیالات میں شامل نہ ہو۔ ایسا کرنے سے مجھے یہ آسانی بھی رہتی ہے کہ اس مخصوص خیال کے ساتھ اس کا پس منظر جو اس وقت بے لکھا رہ گیا تھا میرے حافظے میں تازہ ہو جاتا ہے۔ اس عبارت کے ادھورے

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

یہ عبارت ملی ہوگی۔

O

آخر میں اپنے ہم پیشہ ڈاکٹر احمد کا یہ جملہ جو اس نے رواروی میں کہا تھا کیوں نہیں بھول رہا ہوں کہ انسان کو انسان سے ہی چھپانے کا کام بڑے پیانے پر شروع ہو چکا ہے۔ میں تو ایک غریب لڑکے گوری شنکر جو بی.اے.کا طالب علم بھی تھا اور میرے گھر پر اخبار بھی ڈالتا تھا اور جس کے لئے میری ماں آج آٹھ آٹھ آنسو روتی ہے کی کہانی بننے کی ادھیڑ بن میں ہوں۔ اس گوری شنکر کی کہانی جس کے سبب اب اپنے دروازے کی دہلیز دیکھ کر خود میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جب بھی میری نظروں میں گوری شنکر اور اس کے چپراسی باپ کی تصویر ناچتی ہے اور اس ڈیڑھ کمرے کی جھگی نما مکان کی معمولی چھت پر کھڑے انٹینا (Antina) کی تصویر ابھرتی ہے تو گوری شنکر کی بستی میں آئے دن عورتوں اور مردوں کے درمیان گالی گلوج اور مار پیٹ بھی یاد آتی ہے اور پھر بعد میں کسی کا کٹا ہوا سر ملنے پر پولس کی یلغار پھر ان کے چلتے ہوئے ڈنڈے اور جسموں پر بوٹوں کی ٹھوکریں یاد آتی ہیں تو مجھے لگتا ہے کہ میں نے گوری شنکر کے بہانے وہاں کے دو چار چکروں میں ایسا کچھ دیکھ لیا ہے جو شاید میں کبھی نہ دیکھ پاتا۔

O

جب میں غسل خانے سے نکل کر آیا تو ڈاکٹر احمد کی آنکھیں مجھے دیکھ کر چمک اٹھیں اس نے جھینپتے ہوئے یہ اعتراف بھی کیا کہ میری نوٹ بک کی ساری عبارتیں اس نے پڑھ ڈالی ہیں۔ دراصل ہم نے ساتھ ہی ایم. بی. بی. ایس. کیا تھا، تھوڑا آگے پیچھے ایم.ڈی. بھی کیا، اتوار کو ہم دونوں صبح کا کچھ وقت اس لئے ساتھ گزارتے کہ ایک نرسنگ ہوم کھولے جانے کا مرحلہ درپیش تھا۔

پھر اپنے ہم پیشہ وروں میں ہم ہی دونوں ایسے تھے جنہیں ادب و دب سے بھی شوق تھا۔ احمد نظمیں کہہ کر ڈال لیا کرتا تھا۔ اس روز وہ کچھ جلدی ہی آ گیا تھا۔ جب احمد نے نوٹ بک کے سارے صفحات پڑھ ہی لئے تھے تو پھر اگلے صفحات پر یہ سب بھی پڑھ لیا ہوگا۔

O

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

مجھے اب بھی اچھی طرح سے یاد آرہا ہے کہ گوری شنکر باکر کو پہلی بار میں نے اس وقت دیکھا تھا جب میں سویرے سویرے اسٹیشن پر کسی کو چھوڑ کر واپس آیا تھا اور گوری شنکر میرے دروازے میں تازہ اخبار پھنسا کر لفٹ کی جانب واپس آرہا تھا۔ اس کا ماتھا پسینے سے بھیگا ہوا تھا یہ بھی بعد میں معلوم ہوا کہ کبھی کبھی وہ خاص طور پر بیل بجا کر پانی مانگ کر پیا کرتا تھا۔ میری ماں نے بس یونہی باتوں باتوں میں چھوٹی موٹی تفصیلات اس کے بارے میں جان لی تھیں کہ وہ پانچ بھائی بہن ہیں، باپ کی آمدنی قلیل ہے، غربت کے دن ہیں، ماں موم بتیاں بناتی ہے، گوری شنکر اخبار بیچ کر اپنی تعلیم کا خرچ نکالتا ہے۔ کوئی بھی چار باتیں سنا دے، نل پر سے اس کی بالٹی اٹھا کر پھینک دے، دو گالیاں دے دے وہ بس دھیرے سے ہنس دیتا ہے۔ کیونکہ اس کے خیال میں سب لوگ ایک جیسے نہیں ہوتے اور نہ انھیں ہونا چاہئے۔ گوری شنکر کا باپ روز سویرے پوجا کے وقت ایک پرانے کیسٹ پلیئر پر جو اس کا بڑا لڑکا کبھی لایا تھا کسی مہارشی کا پروچن کا کیسٹ ضرور بجاتا ہے اور روز مہارشی کے یہ الفاظ بلا ناغہ اس کے گھر میں ضرور گونجتے ہیں،

جب تم دوسروں کے بنا جی نہیں سکتے تو ایسی چیز کیوں چنتے ہو جس سے بس تمہارا لابھ ہو اور جن کے بنا تم جی نہیں سکتے ان کا نقصان۔ ایسی حالت میں جب دوسروں کے لئے جینا ہی اپنے لیے جینے کے سمان ہو گیا ہو تو ایسی سوچ کے ساتھ بھلا کوئی اپنے لئے جی سکتا ہے۔

گوری نے ہی ماں کو بتایا تھا کہ اس کا بڑا بھائی آوارہ ہے، جوئے میں پکڑا گیا تھا۔ ایک ٹیکسی والے کو چاقو دکھا کر اس کی جیب خالی کروانے پر ضمانت ہوئی تھی، تانبے کے تار بھی کہیں سے کاٹ کر لایا تھا۔ ایک بار کوئی نکٹی سی عورت گھر میں لے آیا جو گوری کی بہن کے زیور چرا کر تیسرے ہی دن کہیں چمپت ہو گئی۔ چناؤ کے زمانے میں الیکشن لڑانے والوں کے ساتھ گندی بستیوں کے ووٹروں کو ڈرانے دھمکانے والے مافیا میں شامل ہو کر ان کا کام کرتا ہے، ایسے دنوں میں گھر میں پھل سبزی اور کبھی کبھی ریڈی میڈ کپڑے بھی لاتا ہے۔ سولہ سترہ برس کے لونڈے جو بائیں بغل کے ذرا نیچے دیسی کٹا یا ولایتی استرا رکھتے ہیں گوری کے بھائی کے دوست ہیں جو ذرا میں کسی راہ گیر یا بس کے مسافر یا مٹی کے تیل کے

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

خریداروں کی بھیڑ میں کسی سے الجھ جاتے ہیں تو کپڑے کے اوپر سے ہی ایسا استرا کھینچتے ہیں کہ کپڑے خون سے لال ہو جاتے ہیں۔ خون کی لالی سے آنکھوں کو ملنے والی اس ٹھنڈک کی کمائی کا جشن منانے کے لئے پھر وہ کسی حلوائی خانے میں بیٹھتے ہیں اور گنیش جی کی مورتی پر دوکاندار کی ڈھیر ساری جلائی اگربتیوں کے دھویں اور تیز خوشبو میں بسی ربڑی کھاتے ہیں اور چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے سگریٹ کے دھوئیں کے چھلے بنا کر ہوا میں پھینکتے ہوئے فوطوں کی جڑوں میں ہونے والی کھجلی کو پیجامے کے اوپر سے چٹکی سے مسل کر کھجاتے ہیں۔

○

ممکن ہے باتوں باتوں میں میری والدہ یا بیوی سے گوری شنکر نے اپنی کسی تکلیف کا ذکر کیا ہو کیونکہ میری بیوی نے چائے پر ایک آدھ بار کہا تھا کہ میں گوری کا معائنہ کر لوں، ویسے بھی ہمارے یہاں آنے والی بائیاں اور دھوبی وغیرہ تو گویا مجھ سے مفت علاج کروانا اپنا حق بھی سمجھتے تھے اس لئے میں نے بیوی سے ہدایت کی کہ وہ اسے کلینک بھیج دے، مگر نہ گوری شنکر کلینک آیا اور نہ مجھے ہی یاد رہا۔ گوری شرمیلا بھی تھا اور خاموش طبیعت بھی۔ جس بستی میں وہ رہتا تھا وہاں صحت کی خرابی کے ہزار بہانے موجود تھے۔

○

ڈاکٹر احمد بھی خوب ہے، جب کوئی دلچسپ چیز پڑھ لیتا ہے تو سیدھا فون کرتا ہے۔ میں نے ہلو کیا ہی تھا کہ وہ بول پڑا

"یار انقلابی ادب لکھنا دراصل دو بہت مشکل مرحلوں سے بہت سلیقے کے ساتھ گزرنے کا نام ہے"

"کون سے مرحلے؟"

"پہلا یہ کہ وہ اعلیٰ ادب کا بہترین نمونہ ہو پوسٹر نہ ہو دوسرا یہ کہ وہ تبدیلی کا خوگر ہو اور انقلابی نوعیت کا ہو مجھے نہیں معلوم کہ ادب کے ذریعہ تبدیلی لائے جانے کا کام کس حد تک کیا جا سکتا ہے۔ ابھی میں انہیں خیالوں میں گم تھا کہ ڈاکٹر احمد کا فون پھر آیا۔

"اب کیا مسئلہ ہے؟" میں نے استفسار کیا۔

"یار میں نے ایسا آرٹ تو بہت دیکھا ہے جس میں دھڑکتا ہوا ایک زندہ دل تو

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

ہوتا ہے لیکن مجھے لگتا ہے کہ صرف اتنا ہی کافی نہیں ہے۔ پتہ نہیں کیوں بار بار مجھے یہ لگتا ہے کہ شاید بڑے آرٹ کے دھڑکتے ہوئے دل میں ایک چھوٹا سا سوراخ بھی ہوتا ہے جو کسی طرح کی کثافت کو وہاں ٹھہرنے نہیں دیتا۔'' میں ہنسنے لگا اور اس نے فون رکھ دیا۔

○

آج پھر مجھے یہ بات کیوں یاد آ رہی ہے کہ جہاں جذبات ہوتے ہیں وہاں عقل نہیں ہوتی اس لئے دنیا کے تمام حکمراں عوام کے جذبات کو ہی بھڑکانے والے کاموں کو فروغ دیتے ہیں۔ دنیا کے کسی حصے میں، کسی بھی طرح کی ریاست میں حکمراں ایسا کوئی عمل پسند نہیں کرتے جو عام لوگوں کی عقل اور شعور کو بڑھانے کا کام کرے یہ بڑے جوکھم کا کام ہے۔ ہٹلر کا خیال تھا کہ باشعور ہو جانے پر عوام حکمراں سے سوالات پوچھتے ہیں اور انہیں حکمراں کی گرفت کرنے کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔

میرا ذہن بار بار اس بات کی طرف جاتا ہے کہ اگر گوری شنکر باخبر ہوتا تو کیا یہ انجام ہوتا۔ ایسا دردناک انجام جس نے عرصے تک میرے ہوش و حواس سلب کر دیئے تھے۔ اتنی بڑی بات اور گوری شنکر سے چھپی رہی وہ بات جو ملک، سیاست یا مذہب کے تعلق سے نہ تھی۔ بلکہ خود گوری شنکر کی اپنی ذات اور وجود سے متعلق تھی پولس نے اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ گوری کا بڑا بھائی ٹی.وی. پر پرائم ٹائم میں وہ سیریل بھی دیکھتا تھا جس میں پولس کو خطرناک فراری مجرم مطلوب ہوا کرتے تھے۔ مجسٹریٹ نے تو اس نکتے کی طرف صاف اشارہ کیا تھا جس طرح ابن صفی کو جاسوسی ناولوں میں صرف ایسی تفصیلات سے دلچسپی ہوا کرتی تھی جیسے کہ قتل کس طرح کی کالی رات میں ہوا، جھاڑیوں کے پیچھے سے قاتل کس طرح قتل گاہ تک پہنچا اور کس جانب سے ریوالور کا شعلہ نکلا اور پھر قاتل کے ایک ہاتھ کا دستانہ قتل گاہ پر چھوٹ جانے کے سبب پولس کو قاتل کا سراغ کس طرح ملا، بس وہی حال پرائم ٹائم کے ان سیریلوں کا ہے جو جرائم کے انسداد کی آڑ میں پیسہ کمانے کے لیئے دکھائے جاتے ہیں۔ ان میں اصل واقعے کی سنسنی خیزی پر قتل اور خون اور سسپنس وغیرہ کا ڈراما بنا کر عوام کو دکھانا یا ابن صفی جیسی جاسوسی ناول لکھ کر بیچنے تک تو معاملہ سکراں طبقے کے لئے خوشگوار رہتا ہے لیکن اس کے آگے ایسی مزید تفصیلات کہ انسان کیا ہے؟ اور کیوں قتل کرتا ہے اور قانون کس طرح قانون

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

بنانے والوں کا ایک مسلسل جبر کی صورت اختیار کر لیتا ہے دراصل ابن صفی کو ابنِ صفی نہ رہنے دے کر داستوو سکی بنا دیا کرتا ہے، اور بس یہی وہ منزل ہے جو حکمراں طبقے کے لئے خطرے کی بو بن جایا کرتی ہے۔ کیونکہ انسان کو خود اس کے آر پار دیکھنے کا موقع فراہم کرنا دراصل اپنے ہی اقتدار کو اپنے ہی ہاتھوں پھانسی پر لٹکا دینے کے برابر ہوا کرتا ہے۔

وکیل نے گوری شنکر کے معاملے میں جرح کرتے وقت یہ نکتہ اٹھایا تھا کہ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ اقتدار کی خوشنودی کے لئے گوری کو یہ بتانا ضروری نہ تھا کہ ملک کیا چیز ہوتی ہے، سیاست کس طرح بھرے گھر اجاڑتی ہے اور مذہب کو کس طرح اپنے مفاد کے لئے استعمال کیا جاتا ہے تو بھی گوری شنکر کا اتنا حق تو ضرور بنتا تھا کہ وہ خود اپنے بارے میں اتنا تو جان سکے جتنا جان لینے سے اس کی زندگی اور موت وابستہ ہو۔

پولس نے گوری کے آوارہ بھائی کو تو بند ہی کر لیا تھا، ہو سکتا ہے مارا پیٹا بھی ہو، بڑے بھائی نے یہ قبول کر لیا تھا کہ اس نے کسی بہانے سے گوری شنکر سے ان سارے لوگوں کے پتے ٹھکانے بلڈنگوں کے نام اور فلیٹ اور ان کے مکینوں کے نام معلوم کر لیے تھے جہاں جہاں وہ اخبار ڈالتا تھا۔ پولس کو تو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اس علاقے کے کن غنڈوں کو گوری شنکر کے بڑے بھائی نے گوری سے حاصل کی ہوئی وہ ٹھوس معلومات فراہم کی تھی۔ ظاہر ہے کہ جب بہ یک وقت ایک محدود علاقے کی مختلف بلڈنگوں کے مکانوں میں صرف ایک خاص فرقے کے لوگ متاثر ہوں اور باقی تمام گھروں پر غلطی سے بھی کوئی افتاد نہ پڑی ہو تو پولس کے لئے نتیجہ نکالنا آسان ہو جاتا ہے۔ یہ تو درست ہے کہ جو کچھ کیا جانے والا تھا وہ بدقسمتی سے نہ ہو سکا مگر دیکھا جائے تو کل ملا کر جو جانی اور مالی نقصان ہوا تھا اتنا شاید نہ ہوتا بشرطیکہ متاثر گھروں کے پڑوسیوں کو اپنی عافیت کے مدنظر اپنے دروازے کے اندر سے دبک کر صرف اتنا ہی دیکھتے رہنے کی کہ جتنا دروازے پر لگی میجک آئی دکھا سکتی تھی کی عادت پرانی نہ ہو گئی ہوتی۔ ظاہر ہے کہ پڑوسیوں نے بھی کچھ کھو کر ہی یہ عادت ڈالی ہو گی۔ مگر پولس کی ڈیوٹی میں یہ شامل نہ تھا کہ وہ یہ بھی دیکھے کہ پڑوسی کیا پا کر کیا کھوتے جا رہے ہیں اس لئے اس نے پڑوسیوں سے صرف اتنی ہی باز پرس کی جتنی اس کے لئے ضروری تھی۔

○

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

اس واقعے کے دو دن پہلے کی ہی تو بات تھی۔ میں کلینک سے اٹھ کر گھر میں داخل ہوا تو دیکھا گوری شنکر ایک کونے میں ڈرائنگ روم کے فرش پر بیٹھا ہوا ہے اور میری ماں اس سے باتیں کر رہی تھی۔ انہوں نے بتایا کہ ان کی ضد پر بڑی مشکل سے گوری آیا ہے اور میں کھانے کی میز پر بیٹھنے سے پہلے اس کا معائنہ کرلوں۔ میں نے اس کا چیک اپ کیا کچھ متعلقہ ٹیسٹ اور ایکسرے کرانے کی ہدایت کے ساتھ اپنے ایک دوست پیتھالوجسٹ کے لئے پرچہ بنا کر گوری کو دے دیا اور دوپہر میں اسے فون بھی کر دیا کہ وہ گوری کی فیس وغیرہ کی رقم میرے حساب میں ڈال دے۔

دوسرے دن اتوار تھا چائے کی میز پر اخبار مانگا تو پتہ لگا اخبار نہیں آیا تھا۔

لمبے وقت تک بریک ڈاؤن کے قابو نہ آنے کے سبب بجلی نہ ہونے کی وجہ سے پنکھا بھی رکا پڑا تھا۔ میں بددلی کے ساتھ کلینک میں بیٹھنے کے لیے تیار ہوا۔ صبح دو گھنٹے اتوار کو اس کے لئے مخصوص تھے۔ کلینک میں بھی مشکل سے وقت کٹا۔ وقت پورا ہو جانے پر میں کلینک بند کرنے اٹھ ہی رہا تھا کہ پھر جو کچھ ہوا اسے بیان کر لے جانے کی کوشش میں اکثر اپنے لکھنے کی میز پر میں یہ نوٹ بک کھول کر بیٹھتا ہوں، ہزار طرح سے سوچتا ہوں، لفظوں کو تلاش کرتا ہوں اور کچھ دیر بعد ویسے ہی پسینے پسینے ہو جاتا ہوں جس طرح گوری شنکر میرے قدموں میں پسینے سے شرابور پڑا تھا۔

میرا فلیٹ عمارت کی گیارہویں منزل پر تھا اس پر دو گھر اور تھے۔ جو گزر گیا تھا اس سے دونوں گھر کے لوگ بہت زیادہ خوفزدہ تھے اور ان سب کا مشورہ بھی یہی تھا کہ وقت ضائع کئے بغیر پولس کو اطلاع کر دی جائے۔ پولس آئی تو ضابطے کی کارروائی کیا اور کیسے ہوئی ایک ہی سوالات کئی بار مختلف طریقے سے کیسے پوچھے گئے مجھے شاید اس لئے یاد نہیں رہ گئے کہ میرا وجود اس گھڑی جیسے تحلیل ہو چکا تھا۔

ابھی بھی میری کیفیت تقریباً وہی ہو جاتی ہے، کس طرح سے ان امنڈتے ہوئے جذبات سے خود کو باہر نکالوں؟ کیسے تحمل اور ایمانداری کے ساتھ گوری شنکر کے اس واقعے کو قلمبند کروں جو ادب بھی ہو اور اندھیری راتوں کے لیے قندیل بھی۔ کیا میں ایمانداری سے یہ بات بیان کر سکتا ہوں کہ بجلی نہ ہونے پر لفٹ ناکارہ ہو جانے کے سبب گوری شنکر اس گیارہ

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

منزلہ عمارت کی ساری سیڑھیاں کس طرح چڑھا ہوگا۔ ہر زینے پر قدم رکھتے ہوئے پھولتے ہوئے دم اور بڑھتی ہوئی تھکن سے لڑکھڑا کر وہ اوپر آتے ہوئے کتنی بار ڈگمگایا ہوگا کتنی بار اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا پھیل گیا ہوگا، ایسا لگا ہوگا کہ دم اب نکلا اور تب نکلا، پورے بدن سے چھوٹتے پسینے میں نہاتے ہوئے، لرزتے کانپتے اور تیز دھونکنی کی طرح آتی جاتی بدحال سانسوں کے ساتھ تقریباً ۱۷۰ سیڑھیاں اس نے کیسے چڑھی ہونگی۔ اور ہر نئی منزل کے زینے پر قدم بڑھانے کے لئے اس نے اپنی طاقت اور اپنی ہمت کو کس طرح سمیٹا ہوگا۔

گوری شنکر کی بیکسی اور لاچاری کے ان لمحوں کو کیسے بیان کروں جب گوری شنکر نے اپنے بڑے بھائی کے کسی ساتھی کے ذریعہ ملی خبر کو مجھے بروقت پہنچانے کے لئے اپنی اکھڑی اور ڈوبتی ہوئی سانسوں سے آخری جنگ کرتے ہوئے بس اتنا کہا تھا'' گھر چھوڑ دیجئے۔ رات میں حملہ ہوگا''۔

تھوڑی دیر بعد ہی تو آس پاس کے ایک ہی فرقے کے لوگوں کے گھروں سے جن کے پاس میرے گھر سے پہلے گوری ہو آیا تھا فون آئے تھے سب نے ہی فون پر مجھ سے پوچھا تھا کہ کیا گوری میرے پاس پہنچا۔ اور اس نے مجھ سے ملکر کیا کہا۔

میری ماں عمارت کی سیڑھیوں کو دیکھ کر بہت روتی ہے
میری بیوی نے صبح دروازہ کھولنا بند کر دیا ہے۔

میں جس طرح حملوں اور جوابی حملوں کی چلی آ رہی رسم کی تفصیلات کو ان کہا چھوڑ رہا ہوں سوچتا ہوں گوری شنکر کے بارے میں اتنا کچھ کہہ کر بہت کچھ نہ کہہ پاؤنگا اور وہ ان کہا رہ جائے گا۔ گوری شنکر غریب جانتا بھی تو کیسے جانتا جبکہ یہ تو خود مجھے اس وقت معلوم ہوا جب میں نے اپنے دوست پیتھالوجسٹ کی بھیجی گوری شنکر کی ایکسرے پلیٹ کو روشنی میں آر پار دیکھا۔

گوری کے دل میں ایک چھوٹا سا سوراخ تھا اور مجھے بچانے کے لئے اس کے درمیان ۱۷۰ سیڑھیاں حائل تھیں۔

(۱۹۹۷ء)

□□□

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

چیلیں

وہ پانچ برس کا تھا۔

دُور آسمان پر کبھی کبھی اڑتی چیلوں کو دیکھتے ہوئے کھو جایا کرتا۔

اُن دنوں سردیوں میں شام ہوتے ہی راہگیروں پر کتے بھونکنے لگتے تھے۔ پر رات ۹ بجے جب بے حد گہرا سناٹا ہو جاتا، گھروں کے دروازے اندر سے بند ہو کر گلیوں کی ویرانی کو اونگھتے ہوئے تاکتے رہتے تو اس وقت کشمیری چائے بیچنے والے کی آواز آتی۔ نام دلاور تھا۔ پیروں میں ایڑیوں سے باہر نکل جانے والی کلکتہ جُوتیاں، انگلیوں میں عجیب و غریب پتھروں کی انگوٹھیاں۔ رات میں اسکی پُراسراری آواز سے بھاری دروازے چرچرا کر کھلتے، زرا سا سر باہر نکال کر دلاور کو پکارا جاتا، کھمبے پر لگی مٹی کے تیل کی لالٹین کی دھیمی روشنی میں دلاور کی چائے کی پیالیاں کھڑکھڑاتیں۔ گلابی رنگ کی چائے جس میں بادام ڈالے جاتے تھے۔

جب وہ آٹھ برس کا تھا تو اکا دُکا گھروں میں ریڈیو تھے، اس میں پنکج ملک کے گانے بجتے تھے۔ تب وہ لٹو نچاتا تھا۔ چھوکریوں کے ساتھ اکو بکو کھیلتا تھا۔ ایک گوری سی لڑکی تھی۔ کھڑے پائچوں کا پائجامہ پہنتی تھی، چھوٹی مگر موٹی سی چوٹی تھی اسکی، ناک میں کالا دھاگا تھا، اسے دوپٹے کی زیادہ ضرورت نہ تھی مگر گلے میں ڈالے رہتی۔ کمرخ تو ہر وقت اسکے ہاتھ میں ہوتی۔ ایک دن وہ لیا چنے کھا رہا تھا۔ لڑکی ٹکر ٹکر اسے کھاتے دیکھ رہی تھی، بڑی ندیدی تھی۔ لیا چنے مانگ بیٹھی، لڑکے نے اسکے بدلے کمرخ مانگی مگر تب تک لڑکی نے کمرخ کا آخری ٹکڑا منہ میں رکھ لیا، لڑکے نے اسکا منہ کھلوایا اور انگلی منہ میں ڈال دی، لڑکی نے انگلی دانتوں سے دبالی، لڑکے نے تب اسکے بال مٹھی میں بھینچ لئے، لڑکی نے منہ کھول دیا، لڑکے نے منہ کے لعاب میں لتھڑا ٹکڑا اُسکے مُنہ سے نکال کر اپنے منہ میں رکھ لیا، لڑکی رونے لگی تو اس نے مٹھی بھر لیا چنے اسے دے دیئے۔ لڑکی نے رونا ملتوی کر دیا مگر ہنسی تب جب اس نے لڑکی کی ہتھیلی پر پنسل سے چاند بنایا۔ گدگدی سی ہوئی تو وہ ہتھیلی ایک جگہ نہیں

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

روک پائی۔ چاند ٹیڑھا ہوگیا۔ لڑکے کو چاند کے بگڑ جانے کا کئی روز قلق رہا۔ لڑکے کو اُن دنوں دوپہریں اچھی لگتی تھیں۔ سب کی نظریں بچا کر اور پتلا سا بانس لیکر جسکے آخری سرے پر موٹا تار بندھا تھا وہ نکل پڑتا، خوب لو چلتی خوب دھوپ ہوتی، آسمان پر، پر پھیلائے اکا دُکا چیلیں بھی بولتی سنائی دیتیں، وہ انکی اونچائی کو سر اٹھا کر ناپنے کی کوشش کرتا پھر ہنومان مندر کے پیاؤ سے خوب ڈھیر سا پانی چلّو لگا کر پیتا، ماں کہتی تھی پیٹ میں پانی رہے تو لو نہیں لگتی۔ بانس سے جنگل جلیبی توڑتا جنکے کوئے لال ہوتے اور اوپر کا چھلکا چیخ جایا کرتا انھیں چھپا کر رکھتا، تب ایک لڑکا ہوا کرتا تھا، وزیر نام تھا اس کا جسے اسکی ماں بڑے سے پیالے میں چائے کے ساتھ دو گرم گرم چپاتیاں توڑ کر کھلاتی تھی۔ وزیر کا باپ اندر اندھیری سی کوٹھری میں زمین پر دری بچھا کر لیٹا تھا۔ اسکے برابر ہی املی کے کوئلے راکھ کی تہہ کے نیچے جلتے رہا کرتے تھے جنھیں وہ لوہے کی چھوٹی سی چمٹی سے راکھ کے اندر سے نکالتا تھا اور مدک کے چنٹے پر کانپتے ہاتھوں سے رکھتا تھا۔ کوئلے سرد پڑ جاتے تو وزیر کی ماں کو ننگی ننگی گالیاں دیتا۔ لال املیوں کے بٹوارے پر ایک دن وزیر سے اسکی لڑائی ہوگئی تھی، وزیر نے ایک بدحال نواب کے گرتے مکان کی لکھوری اٹھا کر اسکے کھینچ ماری تھی، ماتھے سے خون اتنا بہا تھا کہ کرتا سینے سے چپک گیا تھا۔

جب وہ لڑکا دس برس کا ہوگیا تو کندھے پر پانچ سیر گیہوں پاس کی چکّی پر پسوانے لے جاتا۔ ہاتھ میں دبے پانچ آنے کی گرمی اسے بھلی لگتی، چکّی والے کو نقد پیسے نہ دیکر وہ اتنی قیمت کا آٹا کٹوا کر پسائی کی اجرت ادا کرتا پھر اپنے دوست حشمت کو بتاتا کہ سنیما کے ساڑھے پانچ آنے والے ٹکٹ میں دو پیسے کم ہیں۔ حشمت دو پیسے اپنے پاس سے ملا دیتا اور دونوں نادیا کی فلم ہنٹر والی دیکھتے۔ حشمت اسکے گھر کی پچھلی دیوار سے ملے ہوئے گھر میں رہتا تھا، دیوار میں ایک کھڑکی تھی جو حشمت کے گھر میں کھلتی تھی، وہاں حشمت کی بڑی بہن تھی جسکے ماتھے پر سنہرے بالوں کی ایک لٹ چاند کی طرح چپکی رہا کرتی تھی۔ آنکھیں بڑی اور کھوئی کھوئی سی، کبھی کبھی لپ اسٹک بھی لگاتی تھی گھر والے اسے دبی آواز میں خراب عورت کہتے تھے۔ مٹی کا تیل ختم ہوجانے پر اس کھڑکی کے راستے ہاتھ میں بوتل لیکر تیل ادھار مانگنے آتی۔ پھر جب وہ لڑکا بارہ برس کا ہوا تو وزیر کے ساتھ دریا پر نہانے جایا کرتا۔ وہ

Scanned by CamScanner

دونوں تب اکثر اسکول سے بھاگ لیا کرتے۔ دریا پر ہی سڑک کے کنارے بجلی کے تاروں کے نیچے ایک بار اس نے ایک چیل کو مرا پڑا پایا۔ چیل کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں، خوفناک سی آنکھیں نوکیلی اور دھاردار چونچ۔ اتنے پاس سے اس نے کسی چیل کو پہلی بار دیکھا تھا وہ سہم سا گیا تھا۔ وزیر دریا میں نہاتے میں اپنے مخفی عضو کو استادگی کی حالت میں مٹھی سے پکڑ کر پانی کی سطح سے ذرا باہر نکال کر چلاّ تا، یہ دیکھ پھوا، وزیر اس سے تین چار سال بڑا بھی تھا۔ تب شب برات کے موقعے پر انھیں پانیوں میں سجے ہوئے بجرے تیرتے تھے۔ حلوے کے کونڈوں پر نذر نیاز ہوا کرتی، رات بھر پٹاخے چھڑائے جاتے۔ اسی دریا سے ایک دن ماتھے پر چاندوالی حشمت کی جوان بہن کی لاش ملی تھی۔ گھر میں ہونے والی باتوں کی بھنک اس لڑکے کو بھی مل گئی تھی تب اس کو پتا چلا کہ، لڑکی کے کسی یار نے رقابت کی آگ میں جلکر اس چاندوالی پیشانی کو پُل پر سے دھکا دے کر دریا میں پھینک دیا تھا۔

وہ لڑکا جب اٹھارہ برس کا ہوا تو برطانیہ کے چرچل کو ہٹلر پر فتح پا کر بستیوں کی دیواروں پر وی (V) کا نشان بنائے ہوئے چار سال گزر چکے تھے۔ گرمی کی آگ اگلتی گھڑیوں میں صبح سے ہی چیلیں کھلے آسمان پر اڑنے لگتی تھیں۔ انھیں دنوں کسی گلی کوچے میں اگر مزدور بوجھ سے لدے ٹھیلے کے پہیئے کو گڑھے سے باہر نکالنے کے لئے بھی زور لگا کر شور مچاتے تو ان آوازوں پر بھی پڑوس کے لوگوں کے دہشت کے سبب کان کھڑے ہو جایا کرتے، عورتیں آنگن میں جمع ہو جاتیں، مرد چھتوں پر پہنچ جاتے، بوڑھیاں زیور کی پوٹلی بالٹی میں رکھ کر کنویں میں لٹکا دیا کرتیں۔ اور آیت الکرسی کا ورد کرنے لگتیں۔ تب راتوں میں یہاں وہاں یکایک کسی علاقے کا آسمان ایک دم سے روشن ہو جاتا اور ایسا لگتا جیسے رات میں بھی آسمان پر چیلیں منڈلا رہی ہوں جبکہ وہ چیلیں نہ ہو کر آگ کی لپٹوں سے فضا میں اڑایا ہوا خس و خاشاک ہوا کرتا۔ کبھی کبھی دور کی کسی بستی سے عورتوں کی چیخوں کی آوازیں اس طرح آتیں جیسے بہت سی چیلیں فضا میں ایک ساتھ بول رہی ہوں۔ ان دنوں لڑکے کے گھر میں دونوں وقت کھچڑی پکتی ایک دن جب وہ لڑکا قصائی کی دوکان پر گوشت لینے پہنچا تو دوکان کی چق پر اسکو ایک چمکتی ہوئی تلوار نظر آئی جسے قصائی نے علی شیر خدا کی تلوار کہہ کر ٹانگ رکھا تھا۔ وہ لڑکا گوشت لیکر اور چق ہٹا کر باہر نکلا ہی تھا کہ کسی چیل نے

Scanned by CamScanner

تیزی سے جھپٹا مارااور گوشت کی تھیلی اسکے ہاتھ سے جھپٹ لے گئی۔لڑکا ہکا بکا دیکھتا ہی رہ گیا۔وزیر اس واقعے کو سن کر خوب ہنسا تھا۔

وہ لڑکا جب بیس برس کا تھا تو ایک رات اسکا باپ گھر کے دروازے کے دونوں پٹ آندھی کے جھٹکے کے ساتھ کھولتے ہوئے حواس باختہ گھر میں داخل ہوا۔گھر کا ہر فرد جس حال اور جن کپڑوں میں تھا گھر سے باہر کیا گیا۔لڑکے کو جرابیں اور جوتے بھی نہیں پہننے دیئے گئے۔چولھے پر دم کھا چکی کھچڑی کی ہانڈی یونہی دھری رہی،پلنگوں سے پلنگ پوش کھینچ کرعورتوں نے چادر کی طرح اوڑھ لئے۔بستر مسہریاں،الماریاں صندوق اوران میں بھرا سامان،کچن میں پھیلے برتن،ڈرائنگ روم کی کرسیاں میزیں تصویریں سجاوٹ کی چیزیں،باتھ روم میں ٹنگے کپڑے،صابن،تولئے،آنگن میں پڑی تین پہیوں کی سائکل، برآمدے کی الماری میں موٹی موٹی کتابیں رسالے،بچے کا پالنا،کونے میں رکھا دادا کے زمانے کا آر.سی.اے.کمپنی کا اونچا سا ریڈیو،کوٹھری میں بھرا آٹا،چاول،دالیں اور مسالوں کے ڈبے،الگنی پر سوکھتے کپڑے یہاں تک گھر کا ایک ایک تنکہ اپنی اپنی جگہ پر چھوڑ دیا گیا اور دروازے پر تالہ لگائے بغیر وہ لڑکا رات کے اندھیرے میں سب کے ساتھ مسافروں کے ہجوم میں بہتا ریل کے کسی ڈبے میں بھوسے کی طرح بھر گیا۔اور اسکے پیچھے چھوڑے ہوئے گھر کے آنگن م یں پنجرے سے جلدی میں نکال کر باہر پھینکا گیا طوطا جو لمبی قید سے رہائی پا کر اڑنے سے معذور ہو گیا تھا۔نل پر تن تنہا بیٹھا ہوا سوال کرر ہا تھا۔

''مٹھو بیٹے امرود کھاؤ گے؟''اور اوپر اٹریا کی چھت پر اپنے آدھے بازو کھولے ایک چیل گردن نیچے کئے اسے گھور رہی تھی۔

جب وہ لڑکا پینتالیس برس کا ہو گیا تو ایک بار تھکا دینے والا لمبا سفر طے کر کے اس سرزمین پر پہنچا جہاں اسکا وہ گھر تھا جس میں وہ اپنی بچپن کی جرابیں اور جوتے چھوڑ گیا تھا۔ پچھلی دیوار سے لگا اسکے ساڑھے پانچ آنے والے دوست حشمت کا مکان بک چکا تھا،خود اسکے اپنے گھر کی دیواروں اور دروازوں کا حلیہ بگڑا ہوا تھا۔لڑکے کے پاس وزیر کا نیا پتہ موجود تھا اس نے وزیر کو تلاش کیا،وزیر نے اسکی آمد پر آنکھیں بچھادیں اپنے ساتھ لیکر شہر میں گھوما، پھر دونوں دریا کے کنارے گئے وزیر نے وہاں اپنے بچپن کی یادیں تازہ کیں وہیں لڑکے کو وہ

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

چیل یاد آئی جسے پاس سے دیکھ کر وہ سہم گیا تھا۔ وزیر نے باتوں باتوں میں اس سے پتہ کیا کہ جس بستی سے وہ آیا ہے کیا وہاں بھی چیلیں آسمان پر منڈلایا کرتی ہیں۔ اور جھپٹا مار کر ہاتھ سے گوشت کی تھیلی چھین لے جاتی ہیں۔ لڑکا وزیر کے استفسار پر کسمسایا مگر خاموش رہا کچھ دن بعد وہ دل پر ایک بوجھ لئے لمبا سفر طے کر کے اپنے ٹھکانے پر چلا گیا۔

پچاس برس کی عمر کو جب وہ لڑکا پہنچا تو اس نے مسجد میں نماز پڑھنا شروع کر دی۔ اس کے شہر میں تو گلی گلی مسجدیں تھیں جو نمازیوں سے آباد رہا کرتیں، وہ تلاوتوں میں بھی شریک ہونے لگا اور رمضان میں پابندی سے تراویح پڑھنے لگا، وہ اپنے جوان ہوتے اکلوتے بیٹے پر سے جلدی جلدی صدقہ اتارنے لگا اور روز صبح چڑیوں کو دانہ ڈالنے لگا۔ ایک دن بازار میں اسے پیاس لگی، وہ راہگیروں کی پیاس بجھانے کے لئے فٹ پاتھ پر رکھی گئی ٹھنڈے پانی کی ٹنکی کے پاس پہنچا، پانی نکالنے والے المونیم کے معمولی ڈونگے کو اٹھایا تو دیکھا وہ لوہے کی زنجیر سے باندھ کر رکھا گیا تھا۔ اگرچہ زنجیر لمبی تھی مگر اسے روزے اور نمازوں کے اس شہر میں معمولی ڈونگے کو زنجیر کئے جانے پر بڑی حیرت ہوئی اس نے بے چین ہو کر کسی راہ گیر سے المونیم کے ڈونگے کو پابہ زنجیر کئے جانے کا سبب دریافت کیا تو اسے پتہ چلا کہ سلاسل سے آزاد کیا گیا ڈونگا اکثر چوری ہو جایا کرتا ہے۔ اب اس لڑکے پر ایک عجیب سی وحشت طاری ہونے لگی تھی۔ وہ راتوں کو اکثر اٹھ کر بیٹھ جاتا اکثر وہ رات میں گھر لوٹنے پر دروازہ اسی آندھی کے جھٹکے کے ساتھ کھولتا جیسے ایک بار سراسیمگی کی حالت میں اسکے باپ نے کھولا تھا۔ گھر کے سارے فرد اچھل پڑتے اور ہراساں سے اسے دیکھتے۔ انھیں دنوں وہ اکثر بہت سی چیلوں کو حملہ آوروں کی طرح آسمان میں ادھر اُدھر جھپٹتے ہوئے دیکھتا۔

جب وہ لڑکا اکیاون برس کا ہوا تو سڑک پر چلتے چلتے اسکے قدم یکا یک تیز ہو جایا کرتے کیونکہ یہاں وہاں منڈیروں پر اکثر سیاہ اور بھیانک آنکھوں والی چیلیں اسے بیٹھی دکھائی دیتیں۔ مگر جب وہ لڑکا پچپن برس کی عمر کو پہنچا تو ایک دن پورا آسمان اسے سیاہ چیلوں سے ڈھکا ہوا نظر آیا۔ اسے اطلاع ملی کہ قصائی کی دوکان سے گوشت لیکر اب لوگ محفوظ نہ نکل پاتے ہاتھ سے مال ایک جھپٹے میں نکل جاتا ہے۔ لڑکا فکر مند ہو کر اس افتاد کی معلومات کے لئے ضلع کے صدر دفتر گیا تو دفتر کے نوٹس بورڈ پر اسکو ایک مختصر سی عبارت چپکی ہوئی ملی۔ لکھا

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

تھا، چیلوں سے خوفزدہ نہ ہوں یہ اپنے رزق کے ساتھ ہی دنیا میں اترتی ہیں۔

لڑکا ۵۸ برس کا ہوا تو گھر سے نکلنے میں اسے وحشت ہونے لگی، وہ مشکل سے شام کو قریب کے محلے میں اپنے کسی ہم عمر دوست کے گھر چلا جاتا۔ وہاں دو چار ہم جنسوں کے ساتھ بیٹھ کر بغیر شکر کی پھیکی چائے کی ایک پیالی پیتا، سب کچھ دیر چیلوں کی خاصیت پر گفتگو کرتے اور اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جاتے۔

جب ساٹھ برس کی عمر کو وہ لڑکا پہنچا تو غالباً رزق کی تلاش میں چیلوں کے ایک جھنڈ نے اس پر حملہ کر کے اسکی آنکھیں نکال لی تھیں۔ اور ان کی جگہ خون سے لتھڑے دو بھیانک گڑھے رہ گئے تھے اور صدر دفتر کے نوٹس بورڈ پر ایک پُراسراری عبارت چسپاں تھی۔

''چیلوں کی شکایت درج کرانے سے پہلے ذرا صبر اور تحمل سے کام لیں، کیونکہ یہ چیلیں شکر ہے کہ کلمہ گو بھی ہیں۔''

(۱۹۹۸ء)

□□□

MD NADEEM IQBAL

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

دو بھیگی آنکھیں

اسکوائڈرن لیڈر تھامس ریئسم کو ایسا لگا جیسے طیارے کے کاک پٹ میں ان کی سیٹ کے پیچھے ان کا ساڑھے تین برس کا بیٹا کھڑا ہے اور آئس کریم کھا کر خالی کپ کو اس نے طیارے کے فرش پر ڈال دیا ہے۔ تھامس ایک پل کو مسکرائے اور اپنے ساتھی علی کو جو آٹھ دن بعد چھٹی پر جانے والا تھا اچٹتی نگاہ سے دیکھا۔ انھیں لگا کہ علی ابھی بھی اپنے انھیں خیالوں میں الجھا ہوا ہے جنھیں وقت خس و خاشاک کی طرح اڑا لے جا چکا ہے۔ تھامس کو خیال آیا کہ وہ علی کو بتائے کہ خیالات بھی انسانوں کی طرح ہوتے ہیں ان کے بھی کنبے اور قبیلے ہوتے ہیں، ان کی بھی نسلیں ہوتی ہیں اور ان کے بھی کارنامے ہوتے ہیں اور یک دن وہ بھی عمارتوں کی طرح کھنڈر بن جاتے ہیں۔

ان کا ساتھی تھوڑی ہی دیر پہلے ان سے اپنے کندھے اچکا کر یہ کہہ رہا تھا کہ سارے دادا دادیاں کیوں کہ اب جلدی جلدی جھٹلائے جا رہے ہیں اس لیے سب ہی اب اپنی دانش وری کے جوش میں چیخ چیخ کر بات کرنے لگے ہیں۔ تھامس اس بات پر خوب ہنسا تھا اور چیخ چیخ کر بات کرنے والا ایک ونگ کمانڈر جو خاصا فربہ تھا، اسے یاد آیا تھا، اس لیے علی سے اسکوائڈرن لیڈر تھامس نے مزے لے لے کر یہ وضاحت بھی کی کہ چیخ چیخ کر بات کرنے والے بات میں زور تو پیدا نہیں کر پاتے ہاں چھاتی سے سانس جلدی چھوڑتے ہیں اور پھیپھڑوں کی اس ورزش میں جلدی تھک جاتے ہیں، پھر یا تو ان کا بلڈ پریشر ہائی ہو جاتا ہے یا لو Low۔ ایسا کہنے کے بعد تھامس کو اپنا باپ ضرور یاد آیا لیکن حقیقت یہ تھی کہ اسی وقت علی کی آنکھوں کے سامنے بھی اس کے باپ کی تصویر دوڑ گئی۔ وہ جلدی جلدی چیونگم چبانے لگا۔ علی کا خیال تھا کہ ان لوگوں کا بڑھا ہوا بلڈ پریشر ماحول میں آلودگی پیدا کرتا ہے اور دوسرے کے لیے پُرتشدد ثابت ہوتا ہے۔ اسے ونگ کمانڈر کے ساتھ پھر وہ چیخ پکار یاد آئی جس نے اسٹاف میں بدمزگی پیدا کر دی تھی: علی کو اس بات پر غصہ تھا کہ آخر ایسے لوگ یہ کیوں نہیں جانتے کہ اپنے اعصاب کی کمزوری کے سبب وہ جن پر تشدد کرتے ہیں۔

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

ان کے ذہن پر پہلے ہی سے دنیا کی کم زور اعصابی نے کتنی لڑائیوں کا بوجھ ڈال رکھا ہے اور انھیں کتنے کم وقت میں بے حد اہم فیصلے لینا پڑتے ہیں۔ کاش ان بوڑھوں کو حکومت نوجوانوں سے دور کسی آئی سولیشن وارڈ(Isolation Ward) میں رکھ سکتی۔

تھامس جب مشقی اڑان سے کیمپ پر واپس آیا تو کمانڈ سے آئے نئے احکام اس کا انتظار کر رہے تھے۔ اسی رات اس نے برستے پانی میں فوجی گاڑی سے سفر کر کے کانٹے دار چوہدی سے دور تک گھرے ایسے پختہ عمارتی سلسلے میں پہنچ کر رپورٹ کی جس کے پھاٹک پر اسپیشل آپریشن یونٹ کا بورڈ لگا تھا۔ بارش کی دھند میں لان کے سبزے کے درمیان سُورنگ کے بنے پتلے پتلے راستوں کے کنارے بالو سے بھری آگ بجھانے والی لال بالٹیاں لٹک رہی تھیں۔ ان روشوں پر چلنے والے پراسرار سے ہیولوں میں نظر آرہے تھے۔ ان سب کی وردیوں اور ان وردیوں پر سجے تمغوں اور ان کی رجمنٹ کے نشانوں کو بھاری بھرکم فوجی برساتیاں ڈھکے ہوئے تھیں۔ تھامس کو یہ سوچ کر ایک دم سے ہنسی آگئی کہ جب یہ لوگ صبح صبح کموڈ پر بیٹھتے ہوں گے تو کیسے لگتے ہوں گے۔ پھر اس نے تصور کیا کہ اگر یہ لوگ میونسپلٹی کے دفتر کے بابو ہوتے اور سائکل کے کیریر میں اپنا ٹفن باکس دبائے جھلی دار رنگین اور پھٹی ہوئی برساتی پہنے، اپنے جبڑے بھینچے پیڈل مارتے سڑک پر بھاگتے دکھائی دیتے تو کیسے لگتے۔ آخر ان ہیولوں کو یہ ماحول، یہ کپڑے، یہ تمغے، بالوں کی یہ تراش، بدن کی یہ سختی اور اکڑن، چلنے پھرنے، بولنے سوچنے اور سونے جاگنے کا یہ انداز کس نے دیا، انھیں باقی دوسروں سے الگ کرنے کے لیے دوسروں کو ان سے کس قدر الگ کس قدر مختلف رہنے کے لیے دماغی اور جسمانی طور پر کیسے کیسے جتن کیے گئے ہیں۔

اس کیمپ میں تھامس کو صبح ہی صبح جن معلموں سے سابقہ پڑا تھا ان میں سے کئی اپنی چھاتیوں پر تمغے سجائے سخت چہروں والے لوگ تھے جن کی آنکھیں نوکیلی تھیں مگر لہجے کسی حد تک شائستہ اور باتیں دوٹوک تھیں۔ اسکوائڈرن لیڈر تھامس کو یہ دیکھ کر کچھ حیرت تھی کہ جن ساتھیوں کے ساتھ وہ آیا تھا ان میں اس کا پانچواں ساتھی علی (Tactical Air Command) کے ونگ میں موجود نہ تھا۔ تھامس کو پھر اس معاملے میں مزید معلومات کرنے کا موقع نہ ملا کیوں کہ ایر کمانڈ سے بھیجا گیا آدمی انھیں پڑھانے کے لیے فوراً ہی ان

Scanned by CamScanner

کے سروں پر مسلط ہو گیا تھا اور اس نے کلاس میں قدم رکھتے ہی تختہ، سیاہ پر امریکہ کے سابق سکریٹری CASPER WEIN BERGER کا مقولہ لکھ کر اپنی بات شروع کر دی تھی۔

''جب کبھی بھی آپ کو جنگ لڑنا پڑے اس بات کا امکان ضرور رکھنا چاہیے کہ آپ تمام وہ اسلحہ استعمال کر سکیں جو آپ کو میسر ہیں۔''

اس رات جب تھامس رینسم اپنے مستقر کی آرام گاہ پر پہنچا تو گرم کافی کے ساتھ اس نے اپنی ننھی عمر کے بیٹے کی تصویر کو ذرا غور سے دیکھا۔ خوب تندرست گول مٹول، اماں اسے گود میں تھوڑی ہی دیر لے پاتی کہ بازو دکھنے لگتے، دادا اس کو موٹو کہنا چاہتے تھے مگر گوٹو کہہ کر پکارا، بس اسی دن سے وہ سب کی زبان پر گوٹو ہو گیا۔

تھامس کو علی کے ساتھ اس دن کاک پٹ میں گوٹو کیوں یاد آیا تھا، کافی کا مگ اس نے اسٹول پر رکھ کر سوچا تو اسے ہنسی آ گئی۔ بازار میں صاف ستھرے آئس کریم پارلر کے کنارے ایک سہانی شام میں اس نے بیوی بچے کے ساتھ ابھی کچھ دن پہلے آئس کریم کھائی تھی۔ گوٹو نے خالی کپ سڑک پر ہی ڈال دیا تھا۔ ماں نے بیٹے کی یہ حرکت دیکھ لی۔ ایک بار اس نے شوہر کو کنکھیوں سے دیکھا اور جلدی سے فٹ پاتھ پر پھینکا گیا کپ اٹھالیا، انگلی پکڑ کر وہ بچے کو کنارے رکھی کچرا پھینکنے کی بڑی بالٹی تک لائی پھر خالی کپ گوٹو کے ہاتھ میں دے کر بالٹی میں ڈلوا دیا گوٹو کو یہ سکھانے کے لیے کہ بے کار چیزیں کہاں ڈالی جاتی ہیں ماں باپ کو کئی بار گوٹو کو بازار لا کر مختلف چیزوں کے ساتھ اس طرح کا عمل دہرانا پڑا تھا۔

اسپیشل آپریشن یونٹ میں خاصے لمبے اور تھکا دینے والے دن گزارنے اور جنگی طیاروں کے ان انجینئروں کے خاکوں اور چارٹوں میں گھرے رہنے کے درمیان ایک دن تھامس کو یہ معلوم ہوا کہ اس کا ساتھی علی ملٹری کے سائکالوجیکل آپریشن یونٹ والوں کی قید میں ہے کیونکہ وہ نیوکلیر بم بنانے والے سائنس دانوں کو گالی دیتا رہتا تھا۔ ایک بار یہ بات ایک سنجیدہ جھگڑے کی شکل میں گروپ کمانڈر تک پہنچ گئی جس نے کہا جاتا ہے کہ علی کے خیالات کو منصوبہ بند طور پر ٹریک کروایا اور پھر اسے نفسیاتی ماہرین کے حوالے کر دیا گیا اس لیے وہاں سب سے پہلے علی کو لٹا بٹھا اور چلا پھرا کر ایک بار پھر فوجیایا جا رہا تھا، فوج کے مقاصد اور ان کے حاصل کو ایک بار پھر استدلال کی بھٹی میں پگھلا کر اس کے روزمرہ کی سوچ

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

اور برتاؤ میں اتار اجار ہا تھا۔

ایک دن ایک لیفٹیننٹ نے کینٹین میں بتایا کہ ماہرین نے خفیہ فوجی دستاویزوں کے رکارڈ روم سے رجوع کر کے علی کے معاملے میں ایک دستاویز طلب کی تھی۔ پھر افسران کی زبانی یہ بھی معلوم ہوا کہ علی کا معاملہ کافی طول پکڑ گیا ہے اور اس ضمن میں ہنگری کے مشہور سائنس داں LEO SZILARD کا نام بار بار آرہا ہے جس نے دوسری جنگ عظیم کے دوران جیمس فرینک کی صدارت میں سائنس دانوں کی ایک کمیٹی قائم کرائی تھی۔

تھامس کو اس بات کا شک تھا کہ علی کچھ بے چین سا رہا کرتا تھا۔ ایک رات طیارے پر سوار ہونے سے پہلے اس نے اپنے دادا کے کسی بات پر برس پڑنے کا حال بڑے ڈرامائی انداز میں بیان کیا تھا۔ دادا غصہ کس بات کا اتار رہے تھے یہ تو علی کو یاد نہ رہ گیا تھا، مگر یہ اچھی طرح سے یاد تھا کہ دادا نے اس روز آستینیں چڑھالی تھیں اور درمیان میں حقے کے کش بھی وہ لیتے جارہے تھے، علی کا کہنا تھا کہ ان کی باتیں یکا یک اس فقرے سے گرما گئی تھیں جس میں خاصا طنز تھا۔

''تمھارا زمین سے رشتہ کیا رہ گیا ہے مجھے بتاؤ؟'' وہ انتظار کرتے رہے کہ علی اس رشتے کی وضاحت کرے گا۔ اس انتظار میں انھوں نے حقے کے ایک دو کش بھی لیے لیکن علی کو بھلا بتانے کی کیا پڑی تھی، تو انھوں نے خود ہی چوٹ ماری۔ ''صرف اتنا ہی رشتہ تا جتنی دیر تمھارے تلوے ٹکے ہیں، لیکن اس وقت بھی تمھارے تلوے اور زمین کے درمیان جوتے کا تلا حائل رہتا ہے۔'' علی منہ پھیر کر مسکرادیا تھا تو دادا کی آواز اور بھی مضبوط ہوگئی تھی

''تم لوگوں نے زمین کا شکر گزار ہونا چھوڑ دیا ہے۔''

علی نے بتایا کہ ان کا یقین تھا کہ انسان خاک سے بنا ہے اور اگر انسان زمین کا شکر گزار ہوتا ہے تو زمین بھی اس کی شکر گزار ہوتی ہے۔ اس لیے انھوں نے کہا تھا:

''جو شکر گزار ہونا ہی چھوڑ دے وہ سجدہ شکر کیا ادا کرے گا۔'' ظاہر ہے دادا میاں کا پارہ دھیرے دھیرے چڑھ ہی رہا تھا ورنہ وہ اس بات کو اس طرح طول نہ دیتے۔

''حکم ہے ہر تازہ نعمت کے ملنے اور ہر مصیبت کے دور ہونے کے بعد سجدہ شکر بجا لانا چاہیے۔ حضرت ابراہیم کو خدا نے اپنا خلیل اس لیے بنایا کہ وہ زمین پر بہت زیادہ

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

سجدے ادا کیا کرتے تھے۔'' علی کا بیان تھا کہ ان فقروں کی ادائیگی کے وقت غالباً عقیدت کے سبب دادا میاں کا چہرہ تمتما گیا تھا اور وفورِ جذبات کو دبانے کے لیے انھیں حقے کا کش بھی لمبا لینا پڑا تھا پھر انھوں نے سجدۂ شکر کیسے ادا ہوتا ہے یہ بات بھی ذرا تفصیل سے بیان کی۔

'' جانتے ہو؟ یہ سجدۂ شکر زمین پر ہی ہوتا ہے میز کرسی پر نہیں، پیشانی ہی نہیں دونوں رخساروں کو زمین پر رکھتے ہیں اور دونوں بازوؤں سے زمین کو چمٹاتے ہیں۔ طول دینے والوں نے تو شکر کے سجدے کو اتنا طول دیا کہ پرندے ان کی پیٹھ پر یہ سمجھ کر بیٹھ گئے جیسے کوئی سفید کپڑا پڑا ہے۔'' اس کے بعد دادا جان پر رقت طاری ہو گئی تھی اس لیے آواز بھرا گئی۔

'' ممکن ہے خدا کا کوئی وجود نہ ہو، ممکن ہے حضرت ابراہیم کی کہانی من گھڑت کہانی ہو مگر سجدۂ شکر رہتی دنیا تک قائم رہے گا یہ زمینی حقیقتوں کا اعتراف ہے، ان کے ادراک کا ذریعہ ہے اور زمین تھامے رہنے کا ایک بہانا ہے۔''

تھامس کے شک کی بنیاد علی کے وہ خیالات تھے جو کبھی کبھی بات کرتے میں یکایک اپنی مخفی پناہ گاہ سے باہر آجایا کرتے تھے۔ ایک دن علی نے خاصا زور دے کر یہ بات کہی تھی

'' کچھ لوگ Ground realities کو چھوڑ کر آسمانی سچائیوں کی تتلیاں پکڑنے کے مہنگے شوق میں مبتلا ہو جاتے ہیں'' پھر علی نے بتایا تھا کہ اسے زمین اچھی لگتی ہے۔ جب وہ بمباری سے بچاؤ کی تدبیر میں تازی کھودی گئی خندقوں میں چھپنے کی مشقیں کرتا تھا تو اس میں رینگتے ہوئے کیچوے ایسا لگتا تھا جیسے اسے کوئی بہت ہی حقیر چیز کی طرح نظر انداز کر کے بے نیازی کے ساتھ نکلے چلے جا رہے ہوں۔

پھر ایک دن تھامس کو یہ پتا لگا کہ وہ کمیٹی جو جیمس فرینک کی صدارت میں دنیا کے کچھ بڑے سائنس دانوں کو لے کر قائم کی گئی تھی اس کی رپورٹ کی ماہرین کو اس لیے ضرورت تھی تاکہ وہ اس دستاویز کے ذریعے اپنے مریض کے ذہن سے اس نقش کو مٹا سکیں کہ جاپان پر گرائے گئے ایٹم بموں کے استعمال کے ذمے دار سائنس داں ہیں۔ ماہرین نے اپنے مریض کو اتنا تو یقین دلا ہی دیا کہ سکریٹری برائے جنگ کو ۱۱ ر جون ۱۹۴۵ء کو پیش کی گئی اس رپورٹ نے ان بموں کے استعمال کی سختی سے مخالفت کی تھی اور انھیں غیر ضروری بتایا تھا۔ لیکن اسی دوران ماہرین جب اس نتیجے پر پہنچے کہ ان کا مریض صرف یہی نہیں کہ سائنس دانوں کو

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

گالیاں دیتا ہے بلکہ سینہ تان کر کے نہیں بلکہ زمین کو دیکھتا ہوا چلتا ہے اور اکثر کھیل کے میدان میں گھاس پر اوندھا لیٹ جایا کرتا ہے اور اپنی دونوں بانہیں زمین سے ملا کر پھیلا دیا کرتا ہے اور جب اٹھتا ہے تو اس کی آنکھیں بھیگی ہوا کرتی ہیں، تو کچھ ماہرین کو اس میں دل چسپی پیدا ہوئی۔ یہاں تک کہ نفسیات کے ماہرین نے اس مریض کی فائیل پر Rethinking the unthinkable کی سرخ چٹ چسپاں کردی، کیونکہ بڑی چھان بین کے بعد اسپتال کا کہنا تھا کہ فوجی اخلاقیات کا کوئی بھی اصول اس طرح وضع نہ کیا جائے جو سپاہی کے لاشعوری نظام کے کھانچے میں پیوست ہونے سے منکر ہو۔

ایک رات نئے احکامات کے سبب فوجی گاڑی نے اسکوائڈرن لیڈروں کے اس جتھے کو ماس ڈسٹرکشن ویپنری سسٹمس Mass Destruction Weaponry System کے زمین دوز مستقر میں پہنچادیا جسے وہاں کے لوگ مُخفف کے ساتھ M.D.W.S. پکارتے تھے۔ تھامس کو وہاں یہ دیکھ کر حیرت کے ساتھ خوشی بھی ہوئی کہ علی بھی وہاں ایک دن پہلے سے ہی موجود تھا۔ قبل اس کے کہ تھامس اس سے حال چال لیتا علی نے کیفیت بیان کردی۔

''آئی ایم انڈر آبزوریشن!''

''کس لیے؟'' تھامس نے جاننا چاہا۔

''وہ کہتے ہیں میں فیصلے جلدی کرسکتا ہوں، مجھے عقاب کی طرح جھپٹنا بھی آتا ہے، قوت برداشت بھی غضب کی ہے مگر میں شکی ہوں۔''

''شکی؟'' تھامس نے دہرایا۔

''ان کا خیال ہے کہ مجھے سب کی طرح جیسا ہونا چاہیے ویسا نہیں ہوں''

''کیوں؟''

''کیوں کہ وہ سمجھ نہیں پار ہے ہیں کہ میں پرانا آدمی ہوں یا نیا۔''

''مطلب''؟

''مطلب میرا جھکاؤ کس طرف ہے''؟

یہ بھی ایک عجیب اتفاق تھا کہ وہاں پہلے ہی دن لکچر دینے والے نے کمپیوٹر سے

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

فراہم کی گئی جو معاملات تختہ، سیاہ پر پہنچائیں وہ علی کو چڑھانے کے لیے کافی تھیں۔ بلیک بورڈ پر لکھا گیا تھا۔

بم کا نام	:	فیٹ مین Fat man
رقبہ	:	۳۴۵ میٹر x ۱۴۵ میٹر
وزن	:	۴۵۰۰ کلوگرام
آتشیں مادہ	:	ایک کلو پلوٹونیم
دھماکے کی قوت	:	۲۲ ملین کلوٹن TNT کے برابر
ہلاکت خیزی	:	۲لاکھ ستر ہزار کی بستی میں ایک لاکھ

چالیس ہزار افراد مارے گئے۔ جو بچ گئے وہ موت کی دعا مانگ رہے تھے۔ علی کو ایسا لگا جیسے موجودہ زمانے کے ریلوے ڈرائیور کو پرانے زمانے کے کھٹارا ریلوے انجن کا ماڈل دکھایا جارہا ہو۔ وہ لکچر دینے والے سے شکایت کرنا چاہتا تھا کہ ۶/اگست ۱۹۴۵ء کو استعمال کیے جانے والے بم پر اس کا وقت کیوں برباد کیا جارہا تھا مگر وہ صبر کا گھونٹ پی کر رہ گیا۔ دھیرے سے تھامس کے کان میں بولا۔

''کچھ بھی پوچھنا بے کار ہے کیونکہ میں آبزرویشن میں ہوں۔''

آخر کار وہاں علی اور تھامس کو لمبی اور پیچیدہ تکنیکی اطلاعات، جنگی طیاروں میں اڑانوں کی پرخطر مشقوں اور گہری ہوائی فوجی تربیت کے بعد بے حد قیمتی بمبار کی حیثیت دے کر زمین دوز مستقر سے باہر لایا گیا تھا۔

تھامس کو ہیڈ کوارٹر پر بیوی کا ایک تازہ خط ملا جس میں بیوی نے اس کے شرارتی بیٹے کی مزے دار حرکتیں لکھی تھیں وہ بار بار ماں سے کہتا تھا:

''بابا بولتے، پیچھے پارک ہے۔''

''پارک میں پھول ہیں۔''

تھامس کو اپنے گھر کا ڈرائنگ روم یاد آیا جس سے ملحق ایک صاف ستھرا اور ہرا بھرا پارک تھا اور کھڑکی پارک کی جانب کھلتی تھی۔ پھر اسے یہ بھی یاد آیا کہ کن کن طریقوں سے انھوں نے گوٹو کو یہ ذہن نشین کرایا تھا کہ کچرے کی کوئی بھی چیز وہ کھڑکی سے پارک میں نہ اچھالے۔

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

گوٹو نے حسب عادت اس ہدایت پر بھی باپ کو کیوں؟ کے سوال کا کانٹا لگا کر پھنسالیا تھا اور کبھی کبھی تو اس کی ''کیوں'' کے کانٹے میں باپ اور ماں دونوں ہی کچھ ایسا پھنس جایا کرتے کہ انھیں جواب دیتے نہ بن پڑتا لیکن تھامس کو ہمیشہ اس بات کی فکر رہتی کہ گھر کی جانب سے ایک تنکا بھی پارک میں نہ پھینکا جائے۔ تھامس نے گوٹو کو کھڑکی کے پاس کھڑا کر کے پارک کا نظارہ کرایا تھا۔

''دیکھو پارک میں کتنی پیاری گھاس ہے۔'' گوٹو نے غور سے ادھر دیکھا تھا۔

''اور وہ دیکھو پودوں میں کتنے اچھے پھول لگے ہیں''

پھر تھامس بیٹے کو پارک میں لے گیا تھا وہاں اسے جو بھی بے کار چیز نظر آئی اس کو اپنے ہاتھوں سے اٹھایا پھر ایک آدھ چیز بیٹے سے بھی اٹھوائی اور ایک جانب رکھے کچرا دان میں ڈلوائی، پھر کئی بار بیٹے کو پارک لے جا کر یہی عمل دہرایا۔ ایک بار جب تھامس کے مکان پر اس کی بہن اپنے بچوں کے ساتھ چند روز کے لیے مہمان آنے والی تھی تو تھامس نے ایک کاغذ پر یہ ہدایت لکھ کر کھڑکی پر لگا دی تھی ''بچے پارک کی جانب کچرا نہ پھینکیں۔'' دراصل اس پارک کی دیکھ ریکھ نجی طور پر اس کے ارد گرد رہنے والوں کے سپرد تھی اور کھڑکی سے پارک میں پھینکی جانے والی چیز کی یہ نشان دہی ہونا دشوار نہ تھا کہ وہ کس راستے سے وہاں تک پہنچی تھی اس لیے تھامس نہیں چاہتا تھا کہ منتظمین کی نگاہ میں وہ اور اس کے گھر کے مکین غیر مہذب قرار دیے جائیں۔

اپنی اپنی چھاتیوں پر نئے نئے تمغے سجا لینے کے بعد کچھ عرصے تک تھامس اور علی ایک دوسرے سے تقریباً بچھڑ ہی چکے تھے، بس ایک صبح جب کہ کہرا گھنا تھا وہ دونوں ایک دوسرے سے کچھ ہی دیر کے لیے ایک فوجی ہوائی اڈے پر ملے تھے۔ اس کے بعد پھر کچھ وقفہ گزر گیا دونوں کو ایک دوسرے کی خبر نہ ملی۔ مگر ایک موقع پر جب تھامس کو پانی کے جہاز پر سے بمبار طیارہ اڑانے کی ایڈوانس مشق پر بھیجا گیا تھا تو تھامس کو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ دو اسکوائڈرن لیڈروں میں ایک علی بھی تھا۔ وہ اب پہلے سے زیادہ ہنسوڑ اور کھلنڈرا ہو گیا تھا۔ جب اس نے پانی کے جہاز پر بنی طویل اور کشادہ ہوائی پٹی سے طیارہ اڑا کر واپس اتارا تو کاک پٹ کا ڈھکنا جھٹکے سے پلٹ کر تھامس کو دیکھتے ہی سیدھے ہاتھ کا انگوٹھا ہوا میں اٹھا

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

کرمسکراتے ہوئے بولا

''اب کیا کروگے بیٹا۔اڑانوں کے لیے زمین بھی اب ضروری نہیں رہ گئی ہے۔''
انھیں تربیتی مشقوں کے دوران علی کو الٹیاں ہونے لگی تھیں اور سر میں سخت درد اٹھنے لگا تھا۔ ضروری جانچ کے لیے اسے اسپتال میں لٹایا گیا تو وہاں تھامس اس سے ملنے گیا۔فوجی لائبریری سے کچھ کتابیں آئی تھیں جو اس کے سرہانے دھری تھیں۔ایک کتاب میں آئرش قوم کے لطیفے جمع کیے گئے تھےاور کسی میں بہادری اور سرفروشی کی مہمات تھیں۔تب علی نے تھامس سے کہا تھا:

''کہیں ایسا تو نہیں کہ ہمارے لیے آسمان ہی سب کچھ رہ گیا ہے،زمین نہیں اس لئے ہمارا شکر کا سجدہ آسمان کو دونوں رخساروں سے چھوکر اور دونوں بانہوں میں بھر کر ادا ہوگا۔''اسی ملاقات میں علی نے اس سے کہا تھا:''جس دن سے تم نے مجھے یہ بتایا ہے کہ تم اپنے بچے کو کھڑکی کی طرف سے پارک میں کچرا پھینکنے سے گریز کرنا سکھاتے ہو اس دن سے میں بڑی الجھن میں ہوں۔پتا نہیں یہ الجھنیں مجھے کیوں ہوتی ہیں باقی سب کو کیوں نہیں ہوتیں۔''پھر وہ دھیرے سے بولا۔''ایک دن تو تمھارے بیٹے کو معلوم ہو ہی جائے گا۔''

''کیا۔۔۔؟''تھامس نے سوال کیا۔

''یہی کہ اس کے باپ کی فوٹو اخباروں میں کیوں چھپ رہی ہے۔''

''اخباروں میں؟''

''اور دنیا کی زبان پر اس کا نام کیوں ہے؟''

''کیا بک رہے ہو؟''تھامس کی سمجھ میں علی کی بات نہیں آئی۔

''ہر طرف یہی کہانی چھپ رہی ہوگی کہ تم غنیم کے اسپیس سیکوریٹی سسٹمس Space Secuirty Systems کے نیٹ ورک کو توڑ کر کیسے اندر داخل ہوئے اور فیٹ مین Fat man کے بھی باپ کو طیارے کے پٹ کی کھڑکی سے ہری بھری بستی کے اوپر پھینک آئے۔''تھامس یہ سن کر زور سے ہنسا اور بولا:

''ہم شکر کا سجدہ ہی ادا کریں گے۔''

علی کچھ سنجیدہ ہو گیا،وہ پل تھامس کو نظریں گاڑ کر دیکھتا رہا۔بڑا عجیب سا تاثر تھا ان نکٹی بندھی

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

نظروں کا، کچھ پر چھائیاں کھلی ہوئی تھیں ان نظروں میں جو تھامس نے اس سے پہلے علی کی آنکھوں میں نہ دیکھی تھیں۔

"میری ایک الجھن دور کر سکتے ہو؟" وہ پلک جھپکائے بغیر بولا۔

"میں" تھامس نے کلائی کی گھڑی دیکھ کر ہمکاری بھری۔

"جب تمھارا بیٹا پوچھے گا کہ اس کو پارک میں تم تنکا تک پھینکنے سے روکتے تھے لیکن خود بستی میں کیا پھینک آئے تو تم کیا جواب دو گے؟" مجھے یقین ہے کہ تمھارا بیٹا یہ سوال ضرور کرے گا۔" علی اب بستر سے اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ تھامس نے اسکے کندھے پر ہاتھ رکھا اور ایک لمبی سانس لی۔

"پھر کبھی" تھامس نے کندھا تھپتھپایا مگر علی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"مجھے ابھی جواب چاہیے کیونکہ میں آبزرویشن میں ہوں"۔

"یار آخر یہ آبزرویشن کا کیا چکر ہے"

"شاید انھیں شک ہے کہ میں نیکی کو طاقت سے الگ کر کے تو نہیں دیکھتا"؟

"خود تمھارا کیا خیال ہے؟" تھامس پوچھ کر ہنس پڑا۔

"میرا خیال ہے" علی ذرا رکا پھر منہ پھیر کر بڑبڑایا جیسے وہ تھامس سے نہیں کسی اور سے مخاطب ہو۔

"مجھے یہ شک ہونے لگا ہے کہ خندقیں آسمان جیسی نہیں ہوتیں ورنہ ہم انھیں پناہ کے لیے کیوں کھودتے ہیں۔"

اس جواب پر تھامس، علی کو کچھ دیر ٹکٹکی باندھے گھورتا رہا۔ اسے علی کے چہرے پر اونچی لو دیتے چراغ کی ایک عجیب سی چھنتی ہوئی روشنی دکھائی دی۔ ایسی چمک تھامس نے کبھی اس کے چہرے پر نہ دیکھی تھی۔ وہ اس روشنی کو ماند پڑتے نہیں دیکھنا چاہتا تھا مگر وہ یہ بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ اب سب کچھ پہلے جیسا انسان کی زندگی میں اتنا پے چیدہ نہیں رہ گیا ہے اور لڑائیاں سیدھی سیدھی موت اور زندگی کی ہو رہی ہیں، اس لیے وہ آہستہ سے بولا

"سب سے پہلے سوال تو زندہ رہ جانے کا اٹھتا ہے؟"

"ہاں" علی مسکرایا "میں بھی یہی سوچتا ہوں"۔

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

''اگر تم بھی یہی سوچتے ہو تو پھر زندہ رہو۔'' تھامس کے لہجے اور لفظوں کے انتخاب میں ایک انتباہ تھا جس میں چھپے طنز کو علی نے آسانی سے پہچان لیا۔ دراصل تھامس اپنے غصے کو دبا کر یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ جس طرح سب زندہ ہیں علی بھی زندہ رہے لیکن علی نے اسے غالباً ایک بار پھر خلاف توقع جواب دیا:

''میں ان کے آخری احکام کی ادائیگی تک زندہ رہوں گا'' تھامس ایک لمحہ تو چپ رہا پھر بولا۔:

''آخری حکم تو یہی ہوگا کہ جاؤ اور فلاں پارک میں کھڑکی کے راستے کچرا پھینک آؤ''

''جانتا ہوں۔'' علی نے ایک لمبی سانس لی۔'' میں نے بھی اب کچھ سوچ لیا ہے۔''

''کیا سوچ لیا ہے؟!''

''یہ میرا اپنا ملٹری سیکرٹ ہے'' علی زور سے ہنس کر بولا۔'' تمھیں نہیں بتاؤں گا''۔ تھامس اس کے کندھے پر ہاتھ مار کر چلا گیا۔

علی نے اپنے پلنگ سے ذرا فاصلے پر سبز پردوں سے گھرے عارضی کیبن میں ڈیوٹی پر آئی نرس کو مریضوں سے فرصت پا کر ہمیشہ کی طرح پھر کسی کتاب میں محو پایا۔ کچھ دیر بعد نرس کو وارڈ کی روشنیاں گل کر دینا تھیں۔ علی نے اس کی جانب بستر پر کروٹ لی وہ معمولی ناک نقشے کی تیس بتیس برس کی خاتون تھی۔ اس کے چہرے کے رنگ پر سلونا پن تو تھا مگر دکھ کی ایک پرچھائیں بھی تھی، شاید دل کی گہرائیوں میں پلنے والی کسی جانے یا ان جانے دکھ کی پراسرار پرچھائیں۔ علی نے اسے چھیڑا

''آپ کیا پڑھ رہی ہیں؟'' نرس نے چونک کر علی کی طرف دیکھا، پھر مسکرائی۔

''وہی جو نرسوں کو پڑھنا چاہیے'' پھر اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی''۔ یہ وسلاوا شمبورسکا کی پوئمس (Poems) ہیں جسے نوبل ایوارڈ ملا تھا۔''

''آپ نظمیں پڑھتی ہیں'' علی نے حیرت سے سوال کیا۔

''میرا باپ تمل میں شاعری کرتا تھا۔'' یہ کہہ کر وہ پاس آ گئی۔'' ایک نظم سناؤں'' وہ مسکرا کر کتاب سے پڑھنے لگی:

خدا سوچ رہا تھا، آخر کار

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

آدمی اچھا اور طاقت ور دونوں ہے

پر اچھا اور طاقت ور

ابھی بھی دو الگ الگ آدمی ہیں

ہم کیسے رہیں؟ کسی نے مجھ سے خط میں پوچھا؟

میں بھی اس سے پوچھنا چاہتی تھی یہی سوال

بار بار ہمیشہ کی طرح

جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے

سب سے مشکل سوال

سب سے سیدھے ہوتے ہیں

مریضوں کے سونے کا وقت ہو گیا تھا اس لیے نرس نے اپنی بھیگی آنکھیں چھپاتے ہوئے جلدی سے روشنیاں گل کر دیں۔ مگر اندھیرا ہو جانے کے بعد بھی علی نے نرس سے یہ جاننا چاہا کہ کیا وہ نظمیں پڑھ کر آنکھیں بھی بھگو لیتی ہے وہ جواب کو ٹالنا چاہ رہی تھی مگر علی کی سنجیدہ سی تکرار کے سبب اس نے اقرار کرتے ہوئے کچھ اداس سے لہجے میں یہ بھی بتایا کہ وہ ایسے علاقے سے آئی ہے جہاں سمندر ہے اور تیز ہواؤں میں پھیلی ہوئی بھوک ہے اور جہاں لڑکیاں جوان ہوتے ہی ناچار دور دراز کے علاقوں میں نئی تعمیر کے لیے بنائی گئی خندقوں میں جسمانی اور جنسی مزدوری پر لگا دی جاتی ہیں۔

اس رات علی نے پھر فوجی اسپتال کے بستر پر وہی خواب دیکھا جو ایک آدھ بار مختلف شکلوں میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا کہ وہ بمبار طیارے کے ذریعے کسی پارک پر کچرا گرانے کے لیے جھپٹ تو رہا ہے مگر کچرا گرا کر طیارے کو آسمان کی بلندیوں کی طرف نہیں واپس لا رہا ہے بلکہ اپنے ساتھ زمین پر ہی گر جانے دے رہا ہے۔

علی کو خوشی ہوئی کہ اس کا فوجی راز اس کے خوابوں میں محفوظ تھا مگر اس خواب میں دھندلی سی ایک چیز اور بھی شامل تھی۔ بادلوں کے پیچھے سے جھانکتی دو بھیگی ہوئی آنکھیں۔

(۱۹۹۹ء)

□□□

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

انُّو کا گھر

انُّو اپنی بیوی کے کمرے میں تھکا تھکا داخل ہوتا ہے۔ پہلے اسکی نظر سامنے کی دیوار پر پڑتی ہے جہاں شیشے کے فریم میں اسکی بوڑھی ساس، کامریڈ رخسانہ کی تصویر لگی ہے، رخسانہ کے چہرے پر موٹے کالے فریم کا چشمہ ہے ایک ہاتھ کندھے سے اوپر اٹھا کر اور مٹھی بند کر کے وہ بڑے انقلابی انداز میں لال سلام کر رہی ہے۔ کامریڈ رخسانہ اب اس دنیا میں نہیں ہے چند ماہ پہلے اس گھر میں اسکی دبی کچلی لاش آئی تھی۔ لاش اس علاقے میں ملی تھی جہاں مدت سے رخسانہ ان قبائلی عورتوں کے حق کے لئے لڑائی لڑ رہی تھی جن کو سرکار نے سینچائی ڈیم کے پروجکٹ کی خاطر ان کی زمینوں سے انھیں بے دخل کر دیا تھا۔ انُّو روز ہی اس کمرے میں اپنی ساس کی تصویر دیکھتا تھا لیکن اس بار وہ اس دیوار کے سامنے ہی کُرسی ڈال کر بیٹھ جاتا ہے۔ اسے یاد آتا ہے کہ وہ دن اسکی ساس کی پہلی برسی کا دن تھا۔ وہ عائشہ کو آواز دیتا ہے مگر اسکی بیوی کچن سے 'ہوں' کر کے ہی رہ جاتی ہے۔ غالباً عائشہ کو بھی یاد نہ رہا ہوگا کہ اسکی ماں جسکو قبائلی علاقوں میں کام کر رہے ٹھیکیداروں نے قتل کروایا تھا آج ہی کے دن ماری گئی تھی۔

انُّو نظریں گھما کر کمرے کا طول اور عرض نگاہوں ہی نگاہوں میں ناپتا ہے، گھر میں اتنے ہی بڑے دو کمرے اور تھے وہ اپنی کرسی پر سے اٹھتا ہے۔ کھڑکی پر جاتا ہے وہاں سے کھڑے ہو کر پچھواڑے کی جانب جھانکتا ہے جدھر چھوٹا سا باغیچہ ہے اور باغیچے میں کامریڈ رخسانہ کے ہاتھ کے لگائے ہوئے دو گن بیلیا کے پھول لہلہا رہے ہیں۔ وہ کھڑکی پر کھڑے کھڑے اس شعر کو ایک بار پھر گنگناتا ہے جس کو وہ مکان میں بس جانے کے بعد کئی بار گنگنا چکا ہے۔

عبرت سے دیکھ جس جایاں کوئی گھر بنے ہے
پردے میں جسم ڈھے کر دیوار و در بنے ہے

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

اُسے خیال آتا ہے کہ عائشہ اگر انّو کو نہ ملی ہوتی تو نہ تو وہ کامریڈ رخسانہ سے کبھی ملتا اور نہ اس کمرے کی کھڑکی میں کھڑے ہو کر رخسانہ کے ہاتھوں سے لگائے پھولوں کو دیکھتا۔ پھر یکا یک باغیچے کی کیاریاں انّو کے خیالوں سے اوجھل ہونے لگتی ہیں اور وہ اپنی زندگی کی پانچ سال پہلے کی گھنی اور پریشان کن یادوں میں لوٹ جاتا ہے۔

کرپارام ٹرسٹ کی عمارت کا ہال، رنگ ٹولی کے ناٹک کی ریہرسل میں چائے کا وقفہ، ڈرامے کی ایک تیز طرّار ایکٹرس جس کا نام عائشہ ہے ایک کونے میں فرش پر بیٹھی اس سے کہہ رہی ہے۔ ''یہ چھ فٹ کا انور شمیم عرف انّو بیل گاڑی کی جگہ ہوائی جہاز تو بنا سکتا ہے لیکن اپنے خوابوں کا سماج کبھی نہیں بنا سکتا کہ خوابوں کے سماج بنتے بنتے ہتھیلی سے پھسل جایا کرتے ہیں۔'' پھر انّو کو اس تیز طرّار لڑکی کی ایک کے بعد دوسری باتیں یاد آتی ہی چلی جاتی ہیں۔ ایک بار کسی ڈرامے کی ریہرسل کے دوران غصے میں عائشہ نے انّو کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یہاں تک کہہ دیا تھا۔

''دیکھئے انّو صاحب تھیٹر کے ذریعے سماج کو بدلنے کی کوشش کے بعد ناکامی یقینی ہے اور آپ جیسی پتلی کھال والوں کے لئے اس ناکامی کا انجام بڑا خطرناک ہے؟''

''وہ کس طرح؟''۔ انّو نے تیور بدل کر پوچھا تھا

''وہ اس طرح کہ جب آپ بار بار اپنے گڑھے ہوئے کرداروں کے ساتھ ناٹک کھیلتے رہنے کے بعد بھی سماج میں اپنی چاہی ہوئی تبدیلی نہیں لا پائیں گے تو اُس بار سے پیدا ہونے والے ہائپرٹنشن کی حالت میں سگرٹیں زیادہ پھونکیں گے پھر کھانسی چلے گی۔ ہاضمہ بگڑے گا بھوک لگنا بند ہو جائے گی، پھر نیند غائب ہو گی، آپکی کمائی پیتھالوجی والے ایکسرے والے، الٹرا ساؤنڈ والے، انجیو گرافی والے اور دواؤں کی کمپنیوں والے دونوں ہاتھوں سے لگاتار چھینتے رہیں گے۔''

''تو۔'' انّو نے کسی اور خیالوں میں ڈوبے ڈوبے ''تو'' کا ٹھوکا لگایا عائشہ فوراً بولی

Scanned by CamScanner

"تو وہ لڑکی جو آپ کو اپنا دولھا بنا کر آپ کے ساتھ رہنے کے خواب دیکھ رہی ہوگی آپکی میز پر رکھے نسخوں، رپورٹوں اور دواؤں کو دیکھ کر پہلی فرصت میں آپکو نمستے کر لے گی۔اس لئے جتنی جلدی ممکن ہو سکے ایسی مہلک بیماری سے چھٹکارا پا کر غسلِ صحت کر لیجئے۔"

انو کو اپنی زندگی کے ختم کر دینے پر راغب کرنے والا ڈپریشن اور اسکے ساتھ عائشہ کی اتنی ڈھیر ساری باتیں اس وقت یاد آ رہی تھیں جب رات کے ۹ بجا تھا رہرسل ہال میں ڈرامے کی تیاری زوروں پر تھی، رشمی تھکی تھکی سی اسکرپٹ کی لائنوں میں کھوئی ہوئی چائے پی رہی تھی جید رسگریٹ بنانے کا کاغذ جیبوں میں تلاش کر رہا تھا اور عائشہ بہ ظاہر انو سے غافل اپنے مکالمے یاد کرنے کی مشق کر رہی تھی۔یکا یک وہ چیخی

"کیونکہ یہ بات آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ تیل کی منڈیوں پر اپنا اقتدار جمانے کے لئے آپ کے پاس اب ایک ہی راستہ ہے کہ بے گناہوں کا خون بہانے والی جنگیں آفاقی نیکی کی آفاقی بدی پر فتح کے نام سے لڑی جائیں۔اور نیکی اور بدی منہ تاکتی رہ جائیں۔"

اسی وقت انو اپنے خیالوں میں کھویا کھویا ہال سے نکل کر اندھیرے میں باہری دروازے کی دہلیز پر جا کر کھڑا ہو گیا تھا۔انو کو عائشہ کی عمر کے ان چھبیس سالوں پر افسوس تھا، جنھوں نے اسکے چہرے سے بھولا پن اور تازگی چھین لی اور اسکے عوض اس کو دے دی تھی وہ ہوشیاری اور وہ پختہ پن جو ذرا سی دیر میں کسی بھی صورتحال کی گہرائی اور حقیقت تک پہنچا دینے میں اس کی مدد کرتا تھا۔انگریزی میں ایم.اے. کا آخری سال تو ابھی رنگ ٹولی میں داخل ہونے کے بعد ڈراموں کے شو کے دوران ہی اس نے پورا کیا تھا۔اس کے علاوہ اس کی لگاتار ڈھیر ڈھیر سی کتابیں پڑھنے کی دیوانگی بھی کلاکاروں میں مشہور تھی۔

عائشہ کی ماں جوانی میں کامریڈ رخسانہ کے نام سے اور اپنی انقلابی تقریروں کی وجہ سے مشہور تھیں۔برسوں کیمونسٹ پارٹی میں اپنے شوہر کے ساتھ دور دراز کے پیہڑ گاؤں میں پارٹی کے کاموں سے پیدل ہی گھومتی رہیں۔اور خدا سے پورے یقین کے ساتھ منکر بھی رہیں۔شوہر کے سیاسی مرڈر (Murder) کے بعد سخت کوشی کی زندگی گزاری لیکن

Scanned by CamScanner

یکا یک آخری عمر میں غالباً عائشہ کے اچھے نمبروں سے ایم.اے. پاس کرنے پر نہ جانے کیا سوجھی کہ دو رکعت نماز شکرانہ ادا کرنے کے خیال سے تھوڑی دیر کے لیے مسلمان ہونا بھی قبول کرلیا۔ کیونکہ اسکے بعد بقول ان کے انھوں نے پھر کبھی نماز نہ ادا کی۔

انّو کو اپنے ہر ناٹک کے شو کے اختتام کے بعد ایک گہری مایوسی اور ڈپریشن سے سابقہ پڑ رہا تھا اس کو لگتا تھا کہ ساری محنت اور تگ ودو ضائع گئی ہے، تو ایسی محروم اور تشنہ زندگی کو جی کر کیا فائدہ۔ وہ دروازے کی دہلیز پر اندھیرے میں کھڑا اپنے کمرے پر جانے کے واسطے قدم بڑھانے کو ہی تھا کہ تیز اور تیکھے لہجے میں زنانی آواز آئی" یہاں اکیلے میں کیا چل رہا ہے۔"؟

سوائے عائشہ کے اور کون ہو سکتا تھا۔ اس نے پلٹ کر عائشہ سے مخاطب ہونے کی ضرورت محسوس نہ کی اور ویسے ہی پھر اندھیرے کو گھورنے لگا۔ حالانکہ اس کے دل کی حرکت کچھ تیز ضرور ہوگئی تھی۔ عائشہ نے اسے پھر ٹوکا۔

" کیوں استاد جی کہیں آپ یہ تو نہیں سوچ رہے کہ جن ڈراموں کو شیکسپئیر کے نام سے کھیلا جاتا ہے، وہ دراصل لارڈ بیکن کا مال ہے"

-

" لارڈ بیکن کا مال۔" انّو نے چڑھکر برا سا منہ اسکے فحش مخاطبے پر پہلے ہی بنالیا تھا

" جی جناب لارڈ بیکن جیمز اوّل کے زمانے میں لارڈ چانسلر مقرر ہوا تھا اور ایک نمبر کا راشی تھا" مگر انّو تو استاد جی والے مخاطبے پر چڑھا ہوا تھا جل کر بولا

" دیکھو تم کو پہلے بھی بتا چکا ہوں۔ رنڈیاں اپنے سارنگی نوازوں کو استاد جی کہہ کر مخاطب کرتی ہیں۔"" معلوم ہے کہ آپکی وہاں تک بھی رسائی ہو چکی ہے۔" عائشہ نے مسکرا کر چٹکی لی۔

انّو کے ایک بار تو جی میں آئی کہ عائشہ سے کہہ دے کہ وہ اندھیرے میں اکیلا یہی کھڑا سوچ رہا تھا کہ وہ اپنی آتی جاتی سانسوں کو ختم کرلے لیکن اس نے ایسا کچھ نہ کہا اس نے یہ ذکر بھی نہ کیا کہ اس ڈپریشن کے زمانے میں چند روز پہلے ہی رشمی نے اسکو ایک ایسے ناٹک کی اسکرپٹ پکڑا دی جس کو سرسری طور پر پڑھ کر ہی وہ پریشان ہوگیا۔ عائشہ لگاتار انّو کے

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

چہرے سے اسکے اندر اٹھنے والے جذبات کو اپنی چھٹی حس کے سہارے پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش میں اس طرح لگی رہتی کہ انو کو اسکی خبر بھی نہ ہوتی اس لئے وہ سمجھ رہی تھی کہ انو کے اندر کچھ جل ضرور رہا ہے۔

عائشہ نے جیکٹ کی جیب سے مونگ پھلی مٹھی میں بھر کر نکالی اور اندھیرے میں انو کا ایک ہاتھ پکڑ کر ہتھیلی پر رکھ دیں۔ دونوں کچھ دیر چپ چاپ مونگ پھلیوں کے ساتھ کھٹر کھٹر کرتے رہے پھر عائشہ نے انو کو کریدنا شروع کیا

"خیر یہ بتائے، کیا آپ تھیٹر سے تھک گئے ہیں۔"

"آپ" انو عائشہ کے منہ سے آپ کا لفظ دوسری بار استعمال ہوتے دیکھ کر چونکا

"جی ہاں" وہ شرارت سے ہنسی "جب کوئی رذیل یکا یک شریف ہو کر آپ جناب کرنے لگے تو حیرت تو ہوگی"

جواب میں کچھ دیر خاموشی رہی پھر انو کی آواز سنائی دی۔

"کبھی کبھی لگتا ہے یہ سب پاگل پن ہے"۔ وہ عائشہ کو ایک آدھ بار بند بند لفظوں میں یہ بتا چکا تھا کہ وہ رنگ منچ کے سہارے اپنے اندر کی جان لیوا چیخوں اور کراہوں کو آڈیٹوریم میں بیٹھے بے جان لوگوں تک پہچانے کا کھیل کھیلتے کھیلتے تھک گیا ہے۔ وہ تھیٹر میں پروفیشنسی کی ڈگری ہونے کے باوجود، معمولی اجرت پر ٹورسٹ بسوں کی دھلائی، صفائی کر کے آسمان کی چھت کے نیچے پتھروں پر سو کر چائے اور ڈبل روٹی سے پیٹ بھر کر تمام وہ ناٹک کئے تھے جن کے بارے میں انو کو یقین تھا کہ وہ لوگوں کی سوچ بدل دیں گے مگر جنون کے وہ دن اور فاقہ مستی کی اُن بھوکی پیاسی راتوں کی جب صبح ہوئی تو انو نے دیکھا کہ اس وقت بھی سب کچھ ویسا ہی تھا اور اسکے نئے ڈرامے کا ایک کردار کھیل کا پردہ کھلنے پر ایک ہاتھ میں جام لئے ذاتی مشروبات کی الماری کے سامنے ریشمی گاؤن پہنے امپورٹڈ وہسکی کے نشے میں کھڑا تھا اور ایک نیم عریاں جنسی کشش رکھنے والی لڑکی کو بغل میں دبائے اندھیرے ہال میں بیٹھے بہرے سامعین سے کہہ رہا تھا

"یہ دیکھئے" (اپنی شرابوں کی الماری کی طرف اشارہ کر کے) یہ بوتلیں دیکھ رہے ہیں آپ؟ اب ہم جیسے لُچے، لفنگے اور جاہل لوگوں کے بھی اپنے ذاتی Bar Room ہیں۔

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

صرف اس الماری کی قیمت ۲۰ ہزار روپئے ہے الماری میں قیمتی شرابیں ہیں۔(وہ لڑکی کے ساتھ جھوم کر پوچھتا ہے) کیا آپ جانتے ہیں کہ ہم اور ہماری شرابیں اور ان شرابوں کے نشے سب ہی بے حد خوش قسمت ہیں کہ ان کی ترقی اور حفاظت کے لئے ان کے سروں پر کارپوریٹ گلوبلائزیشن کی نگرانی میں چلائی جانے والی ایک سفاک حکومت پوری طرح مستعد ہے۔ اور تھینک گاڈ کہ اس حکومت کی غیر جانب دار عدالتیں ہیں اور جب ہم غیر جانبدار کہتے ہیں تو اسکا مطلب غیر جانب دار ہوتا ہے اور جب ہم فری پریس کہتے ہیں تو اسکا مطلب فری پریس ہوتا ہے اس لئے اس حکومت کے پاس ایک فری پریس بھی ہے' میں فری پریس کی دعوتیں کرتا ہوں بہت دعوتیں کرتا ہوں ۔ بہت بہت کرتا ہوں ۔(نشے میں مرد زمین پر ڈھیر ہو جاتا ہے عورت اکیلی کھڑی رہ جاتی ہے تھوڑا آگے بڑھ کر تماشائیوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہتی ہے۔)

''دیکھئے بہت معمولی عورت ہوں میں ، یہاں کرائے پر آئی ہوں۔
میں بھی آپ کی طرح ہوں اس لئے کہ نہ میری گاڑی کی چھت پر
لال بتی ہے نہ پیلی اس لئے میرا بھی وہی حشر ہونا ہے جو آپکا ہوگا۔
بولئے تب کیا ہوگا۔؟ خاص طور پر اس وقت جب ہال میں ابھی ابھی
یہ اعلان کر دیا جائے کہ باہر سڑکوں پر کرفیو لگنے جا رہا ہے اور تم
لوگ ،جلد سے جلد اپنے گھروں کو پہنچو بعد میں ہم کو اور تم کو بے قصور
لگا تار دنوں دن خوف کی فضا میں بند رہنے کا جبر سہنا پڑے اور جب
کئی فاقوں کے بعد بازار سے سبزی اور دوا خریدنے کی چھوٹی سی
مہلت دے کر تمھیں پھر قید کر دیا جائے اور تب تمھارے گھر میں نہ
بجلی ہو اور نہ پانی اور تمھارے پڑوسی کے مکانوں سے شعلے اٹھ رہے
ہوں ایسی حالت میں تمھاری انتظامیہ اور پولیس جب تم کو سراسیمہ ،
گونگے لاچار اور خاک اور خون میں لتھڑے کسی روتے بلکتے فلسطین
میں لا کر پٹک دے تو تم کبھی لب پر حرف شکایت نہ لاتا کیونکہ ہر دور
کی شاطر سیاست کے مفاد کے لئے زندہ رکھے جانے والے معمولی

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

اور عام آدمی کو کبھی بھی اور کسی بھی شکائت کا یارا نہیں ہے۔ کیونکہ ان
شکائتوں سے کارپوریٹ گلوبلائزیشن کو کچھ لینا دینا نہیں۔''
(اسٹیج پر موسیقی کا ایک تیز چھنا کہ ہوتا ہے اور روشنی گل ہو جاتی ہے)

ظاہر ہے اس ڈرامے میں کرائے پر آنے والی لڑکی کا کردار عائشہ نے نبھایا تھا مگر اپنا رول ادا کر کے عائشہ کو خوشی نہ تھی۔ ٹولی میں عائشہ کی آمد کی ابتدائی دنوں میں ٹولی کے ڈائرکٹر انو کو اسکے سوا اور کوئی خاص معلومات نہ تھی کہ وہ کھلے دماغ کی ذہین، نڈر اور سمجھدار لڑکی ہے۔ جس کی انگریزی اور حافظہ دونوں ہی اچھے ہیں اور جس میں اداکاری کی عمدہ صلاحیتیں موجود ہیں۔ لیکن یہ کسی نے خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ وہ لڑکی طوفان کے بلاخیز جھکڑوں کی طرح تند و تیز ہے اور زمین پر مضبوط قدموں سے کھڑے رہنے والے کو خس و خاشاک کی طرح اڑا لے جا سکتی ہے۔ پھر تو انو کو تیزی سے یہ انکشافات ہوئے کہ عائشہ دوسروں سے الگ اور بہت کچھ انوکھی ہے اور گریجویشن کے بعد ماں کی ضد پر ایک معمولی پڑھے لکھے لیکن اچھی کمائی کے کرخندار سے شادی ہو جانے کے چھ مہینے کے مختصر عرصے۔ میں ہی سسرال کو لات مار کر گھر آ بیٹھی تھی اور اپنی دوستوں کو اپنی سہاگ رات کی صبح کا وہ دلچسپ واقعہ بھی بتا چکی تھی کہ کس طرح اسکے دولھا کی بوڑھی دادی صبح صبح دلہن کے بستر کو بے داغ دیکھ کر دھک سے رہ گئی تھی اور گھبرا کر جلدی سے مرغی کا ایک چوزہ ذبح کرا کے اور اسکا خون بستر کی چادر پر ٹپکوا کر اور رشتے دار عورتوں کو خون کے دھبوں کی چادر دکھا کر یہ ثابت کیا تھا کہ جس لڑکی کو وہ بہو بنا کر لائی ہیں اسکا پردۂ بکارت پہلے سے پھٹا نہیں تھا۔

عائشہ ڈرامے میں ادا کیے گئے اپنے رول کو لیکر انُو کی ایسی کی تیسی کرنے کی تاک میں تو لگی ہی تھی۔ ایک دن وہ کامریڈوں والا حلیہ اتار کر اور ذرا سج سنور کر لپسٹک وغیرہ لگا کر آئی، آنکھوں میں کاجل جس سے انو کو چڑھ تھی'۔ عائشہ نے اس روز ذرا زیادہ گبرا لگایا تھا وہ ایک آدھ بار اشاروں اشاروں میں اپنے انداز سے انو کو چیلنج کر چکی تھی کہ عائشہ کو چاہنا اس جنم میں انُو کی مجبوری ہے کیونکہ اس کا پالا بڑی بیبڑ لڑکی سے پڑا ہے لیکن چاہے جانے کا عمل ایک لمبا اور اکثر اکتا دینے والا عمل ہوتا ہے کیونکہ بار بار آپ کو ایک ہی ٹھپے کی شخصیت کو بیشتر ایک ہی طرح کے کپڑوں، کھانوں اور بستر کے ساتھ چاہنا پڑتا ہے

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

اس لئے چاہت کو Culture کرنا اور کرانا بہت ضروری ہو جاتا ہے۔ عائشہ اُتُو کو ویسے ٹولی میں سب کے سامنے ریہرسلوں کے دوران سر کہہ کر پکارتی مگر اکیلے میں اپنے ساتھ ہونے والی اُتُو کی ذرا سی بے توجہی پر یا معمولی اختلاف پر یا کسی سنجیدہ معاملے میں اپنا چاہا ہوا نہ پورا ہونے پر وہ اُتُو کو انگریزی اور کبھی کبھی اردو کی مختلف گالیاں سنانے سے بھی گریز نہیں کرتی تھی۔ جب اس ناٹک میں وہ کارپوریٹ گلوبلائزیشن کو برا بھلا کہہ چکی تو بج سنور کر آنے کے بعد اس نے اُتُو سے خاصہ جل کر سوال کیا۔

''اب کس کو کوسنے کا ارادہ ہے؟''۔ اُتُو کو شک تو پہلے سے ہی تھا کہ عائشہ ناٹک میں اپنے رول سے خوش نہیں تھی، اسکے جلے کٹے سوال پر اُتُو نے عائشہ کو کریدا۔

''تمکو اپنا رول پسند نہیں آیا۔ کیوں؟''

''مجھے تو اسکرپٹ ہی پسند نہیں آئی، سارے وقت وہ زمانے کو کوستی رہی ہے، کوئی طاقت ور ڈرامینک ٹائریڈ ہی نہیں بن سکا، تماشائی تقریریں سننے نہیں آتے''۔

اُتُو کے لاشعور میں یہ بات کہیں پڑی تھی کہ عائشہ اس سے باتوں کے دوران اپنی پوری شخصیت کے ساتھ طوفان کی طرح چھا کر اُتُو کو بے زبان اور سراسیمہ کر دیا کرتی تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ ارادے کا کمزور رہا ہو۔ دراصل عائشہ سارے ہی کام جو اسکی نظر میں اہمیت رکھتے تھے، اس انداز سے کرتی تھی کہ اگر جس طرح وہ چاہ رہی ہے اس طرح نہیں ہوا تو شائد دنیا تباہ ہو جائے گی لیکن اُتُو یہ تلخ حقیقت بھی جانتا تھا کہ عائشہ سارے کام اپنی ہی شرطوں پر کرتی تھی اور وہ بھی بڑے وہشت ناک طریقے سے وہ چاہے تھیٹر ہو یا اُتُو کو دھونس بنے کے ساتھ چٹکیاں لے لے کر اور گالیاں دے دے کر چاہے جانے کا مسئلہ۔

ڈرامے میں جس سے عائشہ چڑھی ہوئی تھی وہ شرابی کا رول کرنے والا حیدر تھا ڈرامے میں بار روم کے سین کے دوران جب اس نے عائشہ کو اپنے پہلو سے چمٹایا تھا تو دماغ میں بج اٹھنے والی گھنٹی نے عائشہ کے اندر کی عورت کو یہ بتا دیا کہ حیدر کے جسم سے نکلنے والی ترنگوں کی گرمی یہ بتا رہی ہے کہ حیدر میاں عائشہ سے لائن مار رہے تھے اور ہوا بھی یہی، بس پھر کیا تھا، عائشہ کی تو لاٹری کھل گئی اس نے سوچا اب آئے گا مزہ اب وہ اپنے نرمو ہی معشوق کے عشق میں حیدر سے عشق کا بگھار لگا کر عشق کے کھیل کو زرا چٹپٹا بنا سکے گی۔ یہ

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

سوچ کر عائشہ حیدر پر کبھی کبھی کنکھیوں سے دیکھ کر اپنی مسکراہٹیں ایسے نچھاور کرنے لگی کہ حیدر میاں سارے جوکس بھول گئے اور چھت کو گھور گھور کر ٹھنڈی سانسیں لینے لگے۔ عائشہ کندھے پر لٹکے جھولے میں گھر سے کچھ بھی بنا کر حیدر کو کھلانے کے لئے لانے لگی ایک بار اپنے بالوں کی لٹ کاٹ کر اس نے حیدر کو دی اور کہا جب وہ لٹ کو سورج کے سامنے دکھائے گا عائشہ مدد کو آجائے گی۔ مگر عائشہ کا یہ سارا کھیل اس وقت اتُو کے علم میں ہو رہا تھا جب سانولی سلونی نمکین سی رشمی اپنی ملاحت کے ساتھ چہرے پر سنجیدگی لئے ایک پُر وقار Detachment سے آراستہ بڑے گہرے سوالوں کو لیکر اتُو کو ایک نئے ڈرامے کی پیش کش کی طرف راغب کرنا چاہ رہی تھی۔

ڈرامے کی کہانی کا زمانہ سن ۳۵ کے آس پاس کا تھا۔ ڈرامے کا مرکزی کردار اٹلی کا دورہ کر کے تازہ تازہ ہندوستان واپس آتا ہے اس کا نام ہنومنت کیکرے ہے اور وہ اپنے ملک میں پَل رہے بیرونی اور داخلی دشمنوں کا ایک خاص شعور اور پہچان لیکر نئے جوش وخروش کے ساتھ واپس ہوا ہے کیکرے ملک کے بیرونی دشمنوں سے نہیں بلکہ اندرونی دشمنوں سے خاصہ پریشان ہے لیکن خاص بات یہ ہے کہ کیکرے کے اندرونی دشمنوں میں وہ انگریزی حکمراں سپاہی اور شہری شامل نہیں ہیں جنھوں نے اُس وقت کے غلام ہندوستان کی اقتصادیات کو تباہ کر کے اسکو برہنہ کر دیا تھا بلکہ کیکرے کے داخلی دشمن ہندوستان کے مسلمان ہیں اور وہ کانگریسی بھی جو مسلمانوں سے مورچہ نہ لیکر ان کے آگے جھک جایا کرتے ہیں۔ کیکرے سخت کوشی کی زندگی گزارتا ہے موٹے جھوٹے کپڑ پہنتا ہے اور معمولی غذا کھاتا ہے وہ سناتن دھرم کی بات کرتا ہے خاصی کتابی ہندی بولتا ہے متوسط ہندو طبقے سے اسکا تعلق ہے اور اس کو پکا یقین ہے کہ بھارت کے ہندوؤں کے لئے امن پسندی بے حد خطرناک بیماری ہے اور سیکڑوں سال کی غلامی جھیلنے کے بعد صرف جنگ اور مستقل جنگ ہندو سماج کی کھوئی ہوئی توانائیوں کو اعلیٰ ترین بلندی تک پہنچا سکتی ہے جبکہ گاندھی کا پھیلایا ہوا بیمار عدم تشدد محض اپنے ہی ہاتھوں اپنے آپ کو قربان کر دینے کی بزدلی اور کم ہمتی کا دوسرا نام ہے۔

ایک دن آخر کار چائے کے دوران جب رشمی نے اتُو سے اُس مسودے کے بارے میں اسکا خیال جاننا چاہا تو اتُو نے رشمی کو کریدا۔

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

''یہ اسکرپٹ تم کو کہاں سے ملی؟ یہ پی.سی.ترویدی کون ہیں؟ ترویدی سے لگتا ہے کہ یہ تمھارے کوئی رشتے دار ہیں ۔جنھوں نے یہ ناٹک لکھا ہے۔''

''یہ میرے پتاجی کا لکھا ڈرامہ ہے۔''

یہ جان کر کہ باپ نے بیٹی کے ہاتھوں وہ ڈرامہ انُو کو کھیلنے کے لئے بھیجا ہے وہ پریشان کن حقیقت انُو کے سامنے رفتہ رفتہ کھلنے لگی جس سے وہ دوچار ہو سکتا تھا۔پی.سی.جوشی رنگ ٹولی کے سپرنٹنڈنٹ ہی نہیں اس سیاسی پارٹی کا جنرل سکریٹری بھی تھا جو ملک میں ہندو راشٹر کا خواب دیکھ رہی تھی۔

رشمی یوں تو خاموش مزاج کی تھی مگر کبھی کبھی انُو سے عجیب وغریب سوالات کر بیٹھتی تھی،ایک دن مسلمانوں کی گوشت خوری کو لیکر اس نے خوب بحث کی اور اس بات کو ماننے کو تیار نہ ہوئی کہ گوشت خوری اور تشدد پسندی کے درمیان کوئی رشتہ نہیں ہے اور تاریخ میں انسانی کشت وخون کی ذمے داری مسلمانوں سے زیادہ ان پر ہے جن کا شعار سبزی خوری تھا۔اسکے بعد سے انُو کو لگا کہ رشمی کچھ زیادہ ڈائرکٹ اور تیکھے سوالوں کے ساتھ انُو کے ساتھ الجھتی رہتی تھی وہ پوچھتی تھی۔

''انُو صاحب مسلمان ڈیماکریسی کا ساتھ بھلا کیسے دے سکتا ہے اس کو تو تھیوکریسی پسند ہے اسکے بادشاہ رعایا پر خود کو خدا کا سایہ بتاتے تھے۔ایک دن باتوں باتوں میں وہ سب کے درمیان دھڑ سے بول پڑی تھی۔''مسلمان تو بس اس سمے تک دوسرے دھرموں کے ماننے والوں کے ساتھ گزارا کر سکتا ہے جب تک وہ خود ان پر راج کر رہا ہو۔ دوسرے دھرم والوں کی حکومت میں پرجا بن کر رہنا مسلمان نے کبھی نہیں سیکھا سچی بات تو یہ ہے کہ وہ مِل جُل کر کسی کے ساتھ بھی نہیں رہ سکتا۔انگلینڈ میں رہتا تو انگریز عیسائیوں کے بیچ ہے مگر وہاں بھی اپنی ڈھپلی الگ ہی بجاتا ہے۔''

رشمی نے یہ باتیں عائشہ کے سامنے کی تھیں۔عائشہ نے رات کے کھانے پر ان باتوں کا ذکر

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

اپنی بوڑھی ماں سے کیا۔ دوسرے دن رخسانہ کسی بہانے انّو سے ملنے پہنچ گئی۔ اور وہ باتیں کرنے لگیں جو انہوں نے انّو سے پہلے کبھی نہیں کی تھیں، کہنے لگیں

''میں جب جوان تھی تو لکھنو کے فرنگی محل سے جہاں بہترین مسلم عالموں کے خاندان تاریخی زمانے سے سکونت اختیار کئے ہوئے تھے کچھ جوان اور پڑھی لکھی مسلم لڑکیاں راتوں میں شہر کی دیواروں پر پارٹی کے پوسٹر لگانے کا کام کرتی تھیں۔ وہ بی۔ٹی۔رندیوے کا زمانہ تھا۔ تب ان پڑھ اور نچلے طبقے کا مسلمان ہندوؤں سے اس قدر خوفزدہ نہیں تھا بلکہ ہندوؤں کے سروں پر چوٹیاں دیکھ کر ان پر پھبتیاں کستا تھا اور کسی چوٹی والے ہندو سے تُو تُو میں میں ہو جانے پر اسے چوٹی سے پکڑ کر زمین پر دے مارنے کی دھمکی دے دیا کرتا تھا۔'' کامریڈ رخسانہ نے انو کو بتایا کہ انھوں نے اس مذہبی خاندان میں آنکھ کھولی تھی جہاں بدن پر ہولی کے رنگ کی چھنٹ پڑ جانے پر ماں باپ یہ کہہ کر ڈراتے تھے کہ بدن کی اتنی کھال دوزخ میں جلائی جائے گی جتنی کھال پر ہولی کے رنگ کی چھنٹ پڑتی ہے۔ ہولی میں ہولیاروں کی طرح سارے بدن سے رنگ میں شرابور ہو کر سڑکوں پر ڈھول بجاتے اور ناچتے ہم کہتے تھے جو ہمارا دشمن ہے وہ نہ ہندو ہے نہ مسلمان ہمارا دشمن تو وہ بورژوا ہے جو محنت کشوں کا خون چوس رہا ہے۔'' پھر وہ آبدیدہ ہو گئیں کچھ دیر مرے ہوئے شوہر کو یاد کرتی رہیں پھر بولیں ''ہمکو ہمارے مذہبی ماں باپ نے کیا اسی دن کے لئے عاق کر دیا تھا اب تو بورژوا سوچ نے بہت سے انڈے بچے دیکر ہمارے دشمن بڑھا دئے ہیں، مسلمان نہ تو دودھ کا دُھلا ہے اور نہ فرقہ واریت کسی کی اجارے داری ہے جو کبھی جناح نے کیا تھا وہی آج ہندو کر رہے ہیں۔''

انّو پہلے تو کچھ دیر خاموش رہا پھر بے چینی سے پہلو بدل کر بولا۔

MD NADEEM IQBAL

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

''اب میں سنجیدگی سے سوچ رہا ہوں کہ رنگ ٹولی سے خود کو الگ
کرلوں اور یہاں سے نکل جاؤں۔''

''کیوں۔؟اشتعال سے کام لیکر کیا ملے گا۔'' کامریڈ رخسانہ نے دلار سے کہا ''کیا پھر گندی بسیں دھوکر جینا چاہتے ہو۔'' ''ایک بات اور بتادوں'' رخسانہ اُلّو کے چہرے پر آنکھیں گڑا کر ذرا مضبوط لہجے میں بولی

''میری لڑکی تم سے پیار کرتی ہے اگر تم اس کو نہیں چاہتے ہو تو مہربانی
کرکے اسے اندھیرے میں نہ رکھنا وہی اب مجھ رانڈ بیوہ کے
بڑھاپے کا سہارا ہے۔''

اُلّو سے ملکر کامریڈ رخسانہ جب بستر پر لیٹی تو صورتحال کا سرسری محاسبہ کیا۔ وہ اپنی بیٹی کے مزاج سے خوب واقف تھی اس نے اپنی بیٹی کو بزرگوں کا وہ قول سمجھایا جس میں کہا گیا تھا کہ'' درد اول در دل معشوق پیدا می شود'' اور پھر باتوں باتوں میں یہ بھی بتانے کی کوشش کی کہ معشوق کے دل میں درد پیدا کرنے کے طریقے کیا ہیں؟

ایک دن فلو میں اپنے کمرے کے بستر پر اکیلا پڑا اُلّو رومال میں ناک بہار با تھا کہ بغیر کسی پیشگی اطلاع کے عائشہ اسکے کمرے میں آن دھمکی۔ پہلے تیوریاں چڑھا کر ہاسٹل وارڈن کی طرح اس نے بیچلر روم کا جائزہ لیا ایک طرف بے ترتیب رسالے اور کتابیں پڑی ہوئی دو کرسیوں پر میلے کپڑوں کا ڈھیر ایک ریک پر ڈالڈے کا ایک ڈبہ، ڈبے میں انڈے کا حلوہ جسکے بارے میں پتا لگا کہ اعظم گڑھ سے اس کی پھوپھی نے بھیجا تھا، سگریٹ کے ٹکڑوں سے پٹی ہوئی ایش ٹرے، عائشہ نے چٹکی سے میلے کپڑوں کو ایک طرف ڈال کر کرسیاں خالی کیں ایک بیٹھے پر تنک کر نظروں میں اُلّو کے ٹمپریچر کو آنک کر اُلّو کو جلی کٹی سنا کر جلدی جلدی کمرے کی حالت کو ٹھیک کرکے اور اپنے ہاتھ سے بنائی ہوئی بلیک ٹی کی پیالی اُلّو کو پکڑا کر اور اس میں اسپرین کی ایک گولی ڈال کر بولی۔

''آج یہاں آکر دونئی باتوں کا پتا لگا ہے ایک تو یہ کہ اعظم گڑھ میں تمہاری کوئی پھوپھی ہے دوسری بات یہ کہ اس کے گھر سے تمہارے لئے انڈے کا حلوہ بھی آتا ہے پھر ہنس کر پوچھ بیٹھی'' کیا اعظم گڑھ والی پھوپھی کی کوئی جوان لڑکی بھی ہے جس سے وہ تمہاری

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

شادی وادی کرنا چاہتی ہو؟

جواب میں اُنّو نے اسکو بتایا کہ اس کی پھوپھی لاولد ہے اور بچپن میں اسی نے اُنّو کو پالا ہے کیونکہ اسکے ماں باپ اسکی کم عمری میں ہی مر چکے تھے۔ یہ سن کر عائشہ کو اطمینان ہوا تو اس نے اُنّو کو ذرا تفصیل سے سمجھانے کی کوشش کی کہ تھیسز کے ذریعے سماج میں تبدیلی نہیں لائی جا سکتی اور تھیسز کو اسے کمائی کا ذریعہ اگر بنانا ہے تو اُنّو کو وہی تھیسز کرنا ہوگا جو Statusque کا قائل ہو کیونکہ تھیسز کو وہی لوگ پیسہ دیتے ہیں جو کچھ بدلنا نہیں چاہتے بلکہ جیسا چل رہا ہے ویسا ہی چلتے رہنے کی وکالت کرتے ہیں، اس کی باتیں سن کر اور برا سا منہ بنا کر جب اُنّو باتھ روم میں گھس گیا تو عائشہ نے اس کا بستر خالی پا کر اسکی سلوٹیں درست کیں تکیہ ٹھیک کیا اور جب اُنّو واپس آکر لیٹا تو عائشہ نے تولئے سے اسکے ماتھے پر چمکتا ہوا پسینہ صاف کیا پھر ذرا شرارت سے چہک کر بولی۔

"یار اُنّو میاں۔ تم بڑے خوش قسمت ہو کہ انگریزی کے ایم۔اے۔ میں چار نمبروں سے فرسٹ ڈویزن پانے سے رہ جانے والی ایک کماؤ (تب تک عائشہ کو ایک پرائیویٹ اسکول میں نوکری مل گئی تھی) اور خاصی سیکس اپیل رکھنے والی لڑکی پہلے تو تم سے رومانس اور بعد میں شادی کے لئے بار بار تمکو راغب کرتی رہتی ہے اور یہاں تک بھی راضی ہے کہ چلو! اس سے رومانس ہی کر لو شادی کسی ہندو لڑکی سے اسکے عشق میں ہندو ہو کر کر لینا۔"

اُنّو کو پسینہ آئے چلا جا رہا تھا، شاید اسپرین اپنا اثر دکھا رہی تھی پھر اس پر عائشہ کی زہر بھری باتیں دو پل وہ عائشہ کو گھورتا رہا پھر غصے سے بولا۔

"کمینے پن کی باتیں شروع کر دیں تم نے۔؟"

عائشہ یہ سن کر بھنا گئی، کرسی چھوڑ کر کھڑی ہوئی زمین پر ایک پیر مارا اور اونچی آواز میں چلائی۔

"یو اسکاؤنڈرل۔ بہت لچّے ہو تم۔ اونچے اونچے پوز مارتے ہو۔ میں اندھی ہوں۔ میں پوچھتی ہوں کیوں گھستے ہو اُس کالی کلوٹی

Scanned by CamScanner

چھپکلی کی دُم میں"۔ پھر اس نے اپنے رقیبانہ جذبے کا پول کھول دیا۔
بولی" رہرسل ہال کے ایک کونے میں ننگے فرش پر پاس پاس بیٹھ کر
اور دیوار سے ٹیک لگا کر چائے کی پیالی کے ساتھ کیا گُھسر پُھسر ہوتی
ہے رشمی سے۔ مسلمانوں کی شکل سے نفرت ہے اُس چُڑیل کو بڑی
آئی گرو گولوالکر کی ہوتی سوتی"۔

عائشہ کو اپنے دل کے جلے پھپھولے پھوڑتے دیکھ کر اُتو کو کچھ اچھا بھی لگا اور کچھ غصہ بھی آیا۔ دراصل عائشہ کے عشق نے عائشہ کے دل میں یہ بدگمانی پیدا کر دی تھی کہ اُتو اور رشمی کا کچھ چل رہا تھا ورنہ رشمی کی باتوں سے اُتو کو جس کوفت اور دُکھ سے گزرنا پڑ رہا تھا ان کا ذکر وہ کس سے کرتا۔ اُتو اس وقت کچھ اور پریشان ہو جاتا جب رشمی مسلم معاشرے کی علحدگی پسندی اور ہندو دشمنی کی مثالیں نہ جانے کہاں کہاں سے نکال کر اسکے سامنے سوالات کھڑے کرتی وہ رشمی کی اسلام دشمن باتوں کی بعض سچائیوں کے سبب چھاتی میں اٹھنے والے شکست خوردگی کے تیز دھماکوں کو سُن سُن کر جس طرح سہم سہم جا رہا تھا۔ اس کیفیت نے دھیرے دھیرے اس کو پوری ٹولی سے کاٹ سا دیا تھا لیکن عائشہ اُتو سے بے خبر نہ تھی وہ اُتو کے ذہن میں چپ چاپ جھانک لینا بھی جانتی تھی۔ اس نے لونہی یو.جی.کی وہ کتاب اُتو کو نہیں دی تھی اور وہ یونہی اُتو کی عیادت کے بہانے اسے نہیں سمجھا رہی تھی کہ تھیسز تو خیال کی پیداوار ہے اور خیال تبدیلی لانے کا اوزار نہیں بلکہ ایک خود حفاظتی میکانزم ہے جو ایک value system کی جگہ کوئی دوسرا value system رکھ دیا کرتا ہے لیکن اُتو کو اُس وقت نہ تو پلیٹو میں دلچسپی تھی اور نہ کرشنا مورتی میں وہ کچھ دنوں سے مختلف موقعوں پر عائشہ کے حیدر کے ساتھ لگاوٹ کے برتاؤ کو کنکھیوں سے دیکھ کر دل ہی دل میں جل رہا تھا، وہ چلّا اٹھا

"بند کرو یہ مانگے کے فلسفوں کا بکھان اور میری بات کا جواب دو۔"

"وہ بات حیدر کے بارے میں تو نہیں ہے۔"؟ ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اپنے سوال کا ہتھوڑا جلتے لوہے پر چوٹ کے بغیر عائشہ نے جب دھڑ سے مار دیا تو ایک پل کو اُتو بوکھلا گیا۔ اس نے اپنے کو سنبھالتے ہوئے جواب دیا۔

"اگر بات حیدر کے بارے میں ہے تو۔ یعنی اگر میں تم سے یہ پوچھوں کہ حیدر

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

کو اپنے بالوں کی ایک لٹ کاٹ کر دینے اور میرے اکیلے کمرے میں آ کر اور بخار میں میری خدمت کرنے کے درمیان ایک دوسرے کا کیا رشتہ ہے تو تم بتانا پسند کرو گی۔؟

''پچاس روپے نقد دو تو ابھی بتا دونگی'' عائشہ مسکرائی

لیکن انُو ابھی سنجیدہ تھا۔ سوکھے منہ کے ساتھ بولا۔

''ٹھیک ہے پچاس روپے اُدھار رہے۔''

''اُدھار تو تم نے کوئی بھی آج تک ادا نہیں کیا۔ خیر رشتہ سن لو''

''سناؤ'' انُو سنبھل کر بیٹھ گیا

''وہی رشتہ ہے'' عائشہ پھر مسکرائی'' جو رشتہ لیلیٰ کا مجنوں سے تھا۔ شیریں کا فرہاد سے تھا اور سسی کا۔۔۔۔۔''

''شٹ اپ'' انُو ڈانٹ کر بولا'' وہ تو میں بھی جانتا ہوں مگر اس میں مجنوں کون ہے، رائل فیملی کا گورا چٹا حیدر تا؟ جس نے اسپورٹ میں اسٹیٹ کو ریپریزینٹ کیا تھا اور جس سے تم یہ کہتی ہو کہ جب بھی وہ تمھارے بالوں کی لٹ سورج کو دکھائیگا تو تم اس کے پاس آ جاؤ گی۔'' جواب میں عائشہ بھنا کر بولی

''اس رشتہ کا مجنوں سالا چوتیا ہے'' اس کا چہرہ لال ہو گیا تھا میز پر ایک زوردار مکا دھڑ سے مارا اور بولی'' سالا اپنے کو بہت بڑا انٹلکچوئل سمجھتا ہے اور اب اس چکر میں ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کو تھیسز دکھا کر ان جاہل طوطوں کو مذہبی رواداری سکھائے۔ لیکن میں تو سب کو ٹھینگے پر مارتی ہوں، اُن الو کے پٹھوں سے کبھی نہیں پوچھتی کہ وہ تو موحد تھے، ایک زمانے تک سیاسی Upper hand بھی تھا ان کا، پھر وہ ناروا داری اور Voilent Communalism کا شکار کیوں ہو گئے'' پھر عائشہ نے لپک کر انور کے سر کے بال ایک مٹھی میں بھینچ کر اور دوسرے ہاتھ سے اس کا چہرہ اوپر اٹھا کر بتایا کہ وہ رشمی کے باپ کا لکھا ناٹک'' آکرمن'' انُو کے پڑھنے سے پہلے ہی رشمی سے لیکر پڑھ چکی ہے اور ناٹک میں دویکا نند کا ۱۸۹۹ء میں پربدھ بھارت میں لکھا گیا وہ جملہ بھی اس نے پڑھ لیا ہے کہ ہر وہ آدمی جو ہندو کے دائرے سے باہر نکل جاتا ہے وہ صرف یہی نہیں کہ انسان کی حیثیت سے کمتر بن جاتا ہے بلکہ (ہندو کا) دشمن زیادہ ہو جاتا ہے۔ پھر اسنے انُو کو سمجھایا کہ عائشہ کو اس

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

بات کا پورا یقین ہے کہ وویکا نند نے وہی بات کسی مسلم مولوی سے جب سنی ہوگی تو اس طرح سنی ہوگی کہ ہر وہ آدمی جو اسلام کے دائرے سے باہر نکل جاتا ہے وہ صرف یہی نہیں کہ انسان کی حیثیت سے کمتر بن جاتا ہے بلکہ (اسلام کا) دشمن زیادہ ہو جاتا ہے۔ پھر اٹو کو جھنجھوڑ کر بولی

"اپنے گریبان میں منہ ڈالو۔ اب یہ سن کر تمھارا دم کیوں نکلنے لگتا ہے کہ ہندو کو اگر عزت سے جینا ہے تو اس کو مسلمانوں سے کہیں زیادہ Aggressive بنا ہوگا۔ اب Islamization of Hindusim ہی تمھارا علاج ہے۔"

پھر اٹو نے پہلی بار عائشہ کی آنکھوں کو بھیگا ہوا دیکھا آواز کو کانپتا ہوا پایا اور گفتگو میں خیال کی ایسی روانی پائی کہ وہ پہلی بار کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ عائشہ اس سے کہہ رہی تھی

"لیکن میری پریشانی یہ سب نہیں ہے۔ میرا سیاست سے کوئی لینا دینا بھی نہیں ہے، میری پریشانی تو تم ہو تم جو راتوں کو جاگ کر، مکالموں سے، سازوں سے، لباس سے، میک اپ سے، باڈی لینگویج سے، روشنی اور موسیقی کی زبان سے اگر کچھ تخلیق کرنے کے کام کے بجائے کبھی مسلمانوں کو تو کبھی ہندوؤں کے خلاف گھٹیا کالم نویسی کا ہی محدود کام تھیٹر سے لینا چاہتے ہو تو میں تمھارے ساتھ تھیٹر کر کے اپنی جان کیوں کھپاؤں۔ انگریزی جنرل ازم میں ہاتھ پیر ماروں، جوانی اور چہرے مہرے سے فائدہ اٹھا کر چار دن کی یہ زندگی ستارہ ہوٹلوں میں عیاشیوں کے ساتھ گزار کر اس جہنم سے دیکھتے ہی دیکھتے نو دو گیارہ کیوں نہ ہو جاؤں"۔

اتنا سب کہہ کر عائشہ سرخ چہرہ لیے یکایک چھلک کر بہہ اٹھنے والی آنکھوں کو چھپاتے ہوئے تیزی سے اٹو کے کمرے سے نکل گئی۔

کامریڈ رخسانہ نے بستر پر رات میں لیٹی بیٹی کو جب کروٹیں بدلتے ہوئے پایا تو اپنی بیٹی سے وہ سب اگلوالیا جو عائشہ نے غصے میں اٹو سے کہا تھا، رخسانہ اس وقت بیٹی سے

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

کچھ نہ بولی لیکن دوسرے دن سویرے سویرے چپ چاپ اُتّو سے ملنے چلی گئی۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد وہ اُتّو سے دھیرے سے بولی

"میری بیٹی کی باتوں کا بُرا نا ماننا۔ میں نے اپنا شوہر کھو کر یہ سیکھا ہے کہ زندگی میں خوابوں کی کوئی جگہ نہیں ہے، میری بات اور ہے مجھے تو اب اتنی عمر کاٹ کر خوابوں کی لت پڑ گئی ہے۔ سچ یہ ہے کہ ہر آدمی کے سامنے اس کی حفاظت کا مسئلہ سب سے پہلا مسئلہ ہے۔ رنگ ٹولی اس وقت تک کبھی نہ چھوڑنا جب تک دو روٹیوں کا کہیں سہارا نہ ہو جائے۔ میری بیٹی کہہ رہی تھی کہ رنگ ٹولی کا پریسیڈینٹ تم سے اپنا لکھا ناٹک تیار کروانا چاہتا ہے۔ عائشہ کو ناٹک میں مسلمانوں کے خلاف زہر بھرا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ وہ تو نادان لڑکی ہے۔ تم تو وہ ناٹک کھیلو، ناٹکوں سے کچھ ہوتا نہیں ہے، ہم نے جوانی میں اپنا Ipta کے ذریعہ فرقہ واریت کے خلاف کیسے کیسے ناٹک کھیلے تھے۔ اس کے بدلے آج کیا ملا سماج کو۔"

عائشہ کے اُتّو کے کمرے سے روتے ہوئے نکل جانے کے ایک دو روز بعد ہی رشمی کے باپ شری ترویدی سے اُتّو کی اس طرح بات ہوئی

ترویدی۔ میاں اُتّو کیا یہ خراب بات نہیں ہے کہ چار پیسے کما کر اور جامع مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر مسلمان شاہجہاں بن جاتا ہے اور اپنی اوقات تو اوقات دیش کو بھی بھول جاتا ہے، آپ کا کیال خیال ہے؟

اُتّو۔ میرا خیال بھی وہی ہے جو آپ کا ہے۔

ترویدی۔ آپنے میرا ناٹک "آکرمن" پڑھ لیا؟

اُتّو۔ جی ہاں

ترویدی۔ پارٹی چاہتی ہے کئی شہروں میں اس کے پردرشن ہوں۔ پیسہ ہم لگائینگے، آپ کو الگ سے دینگے۔

اُتّو۔ (چُپ رہتا ہے)

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

ترویدی۔ آپ تو خیر پڑھے لکھے ہیں جاہل اور شرارتی مسلمانوں کی دھرم ورودھی حرکتوں کولیکر اب یہ طے ہے کہ ان سے کورٹ کچہری کے دوارا نہ نپٹا جائے بلکہ ہندوؤں کو ستانے والے مسلمانوں سے جن آکروش کے دوارا بربرتا سے نپٹ لیا جائے، اسلئے میں نے مسلمانوں کو اپنے ناٹک میں سمجھایا ہے کہ وہ اپنا گھر پھنکوانا، مہیلاؤں کی مریادہ لٹوانا اور بچوں کو بے مطلب قتل کروانا ترنت بند کریں۔ یہ بابی ان کو مہنگی پڑتی ہے

اُتو۔ جی ہاں میں نے ناٹک پڑھا ہے۔

ترویدی۔ دیکھئے میاں اُتو اب ہم ہندوؤں کا ہنسا پر قانونی ادھیکار ہماری سب سے پہلی آوشیکتا ہے۔

اُتو۔ جی ہاں ہنسا پر قانونی ادھیکار۔

ترویدی۔ اور ہنسا کے اس قانونی ادھیکار پر صرف ہماری ہی اجارہ داری بھی ہونا طے ہے۔

اُتو۔ ظاہر ہے ہنسا کے اس قانونی ادھیکار پر پاکستان میں جنرل ضیاء نے اپنی اجارہ داری کے واسطے بڑے جتن کیے تھے۔

ترویدی۔ اس کے لیے ہمیں Hindutva کی پرائیویٹ آرمی کو اور بھی بڑھانا ہوگا۔

اُتو۔ بے شک بے شک جنرل ضیاء نے بھی یہی کیا تھا۔

ترویدی۔ بس اسی پرچار کے لیے یہ ناٹک ہے جو آپ کو کرنا ہی کرنا ہے۔

اُتو۔ بالکل بالکل

ترویدی۔ خوشی ہوئی کہ آپ دیش بھکت مسلمان ہیں۔

پی بی ترویدی کے ناٹک ''آکرمن'' میں کیا صحیح تھا یا کیا غلط، کیا اچھا تھا کیا بُرا یہ تو اُتو اس وقت اکیلے لیٹا نہیں سوچ رہا تھا، لیکن بار بار اس کو لگ رہا تھا کہ شہر میں یکا یک روشنی گُل ہوگئی ہے، ہر طرف اندھیرا گھُپ چھا گیا ہے، آسمان میں چہار طرف سے کالے دھوئیں اُٹھ رہے ہیں، کرفیو زدہ سڑکوں پر پولیس گاڑیاں دوڑ رہی ہیں اور اسکے کمرے کا باہری دروازہ کھلا رہ گیا ہے اور اسی وقت تیزی سے دروازہ کھلتا ہے اور سراسیمہ حالت میں عائشہ

Scanned by CamScanner

اندر داخل ہوتی ہے۔ دروازہ بند کرتی ہے، کمرے کی بتی بُجھاتی ہے اور انُو کے پہلو میں لیٹ کر اسے اپنی بانہوں میں بھر لیتی ہے اور انُو سو جاتا ہے۔ اُس نیند میں وہ خواب میں محسوس کرتا ہے کہ عائشہ اس کے چہرے پر اپنے گرم گرم بوسوں کی بارش کر رہی ہے اور کہہ رہی ہے

''نا میں دنیا کو کچھ دینے کا دعویٰ کر سکتی ہوں اور نہ تم کو۔ لیکن میں تم سے بھی کچھ نہیں چاہتی صرف تمھارا پیار چاہتی ہوں، تمھاری ناز برداری کرنا، تمھارے نخرے سہنا، تم سے ہم بستر ہو کر تھک جانا اور اس تھکن کے خیالوں میں دن بھر ڈوبے رہ کر تمھارے اور صرف تمھارے بارے میں سوچنا چاہتی ہوں۔ تمھاری بیوی ہونے اور ساری بلاؤں سے تمھاری حفاظت کر کے تمھاری زندگی کو آسان بنانے والی تمھاری سکھی سہیلی ہونے کا اور پورے زور اور زبردستی سے، پوری دہشت گردی کے ساتھ تم کو Terrorise کر کے تمھاری چھاتی پر سوار ہو کے اپنا معمولی سا تشخص تم پر بار بار واضح کراتی رہنا چاہتی ہوں تا کہ تم کہیں بھول نہ جاؤ۔ عام طور پر مرد عورت کو تحفظ خود سے کبھی نہیں دیتا یہ تو عورت کو طرح طرح کے ہتھکنڈوں سے، کبھی اس پر سب کچھ لٹا کر اور کبھی اسے دھوکا دیکر، مجرمانہ پھوہڑ اور فحش طور طریقوں سے، عیاریوں اور مکاریوں کے ساتھ خود زندہ رہ کر اور اس کو زندہ رکھ کر جسم اور روح کے پورے انہماک اور لگاؤ کے ساتھ اکثر اپنی پوری پونجی داؤ پر لگا کر یہ تحفظ نواز رفاقت اس سے حاصل کرنا پڑتی ہے۔ اسلیئے اگر میں نے مرد کو فتح کرنے کا فضول اور پُر فریب خبط پالا ہی ہے تو پھر مجھے اپنے پیٹ پر Explosive کی پٹی باندھ کر آتم گھاتی حملہ آور کی طرح پل پل مرد کو اس کے عدم تحفظ کا خوف دلا کر ہی اس کو تسخیر کرنا ہوگا کیونکہ زندہ رہنا سب کی سب سے زیادہ انمول تمنا ہوتی ہے''۔

صبح ہوئی تو انُو کو لگا کہ اس کی نیند پوری نہیں ہوئی۔ ایک عجب سے ڈپریشن نے پھر اس کو دن

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

بھر کے لیے جکڑ لیا۔ شام کو اس نے فون کر کے عائشہ سے بات کی اور فیصلہ کن انداز میں بتایا کہ اس نے پی.بی.تر ویدی کے ڈرامے ''آ کر مَن'' کی تیاری کا ارادہ کرلیا ہے۔ اسی شام عائشہ اس کے پاس بھاگی ہوئی آئی ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی نے عائشہ کے بدن کا سارا خون نچوڑ لیا ہو۔ وہ انُو سے لپٹ کر بولی

''میں نہیں مانتی کہ کوئی Silent Majority ہوتی ہے جو وقت آنے پر انصاف کا ساتھ دیتی ہے۔ میں نے اپنے انقلابی باپ کی لاش کو دیکھا تھا جو غریبوں کے حق کے لیے بھوکا پیاسا لڑتا رہا تھا۔ اس کی مردہ آنکھیں باہر نکل آئی تھیں اور ان میں قاتل کی تصویر نہ تھی، پھر وہ انُو سے لپٹ گئی۔ اسے پی.بی.تر ویدی کے ناٹک کے منچن سے روکتے ہوئے اس نے انُو کے گریبان کو دونوں مٹھیوں میں کس لیا اور چیخی ''میں تمھیں ناٹک کی سیاست نہیں کرنے دونگی۔ Silent Mejority حق اور انصاف کے لیے نہیں بولتی، وہ ہمیشہ پہلے اپنے بچاؤ کی تدبیر کرتی ہے۔''

انُو نے عائشہ کی بات نہیں مانی اسلیئے کہ کامریڈ رخسانہ نے انُو سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اگر انُو نے تر ویدی جی کے ناٹک '' آکر مَن'' کا منچن نہیں کیا تو وہ مٹی کا تیل چھڑک کر خود کو آگ لگا لیگی۔ اسلیئے ناٹک کھیلا گیا۔

دراصل عائشہ کو ڈی.اے.وی.کالج میں انگریزی لیکچرار کی ملازمت مل جانے کے بعد بھی دیوالی کی دوسری رات کا ذکر رخسانہ نے نہ تو کبھی اپنے داماد سے کیا اور نہ اپنی بیٹی سے کہ وہ ناٹک کے منچن کے بعد ناٹک کے لیکھک تر ویدی جی سے ان کے گھر پر جا کر ملی تھی اور دیر تک یہ بتانے کی کوشش کی تھی کہ ان کے شوہر کا سیاسی قتل کس طرح ہوا اور کس طرح اپنی بیوگی کے باوجود انھوں نے اپنی لڑکی کی تعلیم پوری کی۔ پھر وہ یہ بتاتی رہیں کہ کس طرح ہنوز وہ اپنی پارٹی کے اعلیٰ مقاصد کے لیے وفادار ہیں انھیں حاصل کرنے کے لیے جی جان سے لگی رہتی ہیں۔

پی.بی.تر ویدی، کامریڈ رخسانہ کو بڑے صاف گو لگے تھے کیونکہ انھوں نے ایک

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

منٹ میں معاملے کی تہہ تک پہنچ کر دوٹوک لفظوں میں رخسانہ سے صاف صاف کہہ دیا

"دیکھئے بہن جی، مجھے پارٹی کے آدرشوں سے اپنی یا اپنے پتی کی وفاداریاں مت گنوائیے، اب کوئی بھی سیاسی پارٹی کسی رد ھتیک وچار دھارا کے آدھار پر نہیں چلتی، اب تمام پارٹیاں منڈیوں اور بازاروں پر حکومت کرنے والوں کے کنٹرول میں رہ کر چلتی ہیں، وہ چاہے ہرے رنگ کی پارٹی ہو یا پیلے رنگ کی۔ آپ تو یہ بتائیے کامریڈ رخسانہ پی.بی. ترویدی سے ملنے کیوں آئی ہیں۔"

یہ سن کر رخسانہ نے ترویدی سے کوئی بحث نہیں کی۔ اپنے شوہر کی قربانی کو بے مقصد ثابت ہوتے دیکھ کر بھی ان کی آنکھیں نہیں بھیگیں۔ خود ان کو بھی منڈیوں کی دلال کہہ کر دی جانے والی گالی کی کڑواہٹ بھی وہ دھیرے سے مسکرا کر پی گئیں اور ترویدی سے بڑی عاجزی اور انکساری سے یہ درخواست کی کہ ڈی.اے.وی. کالج میں انگریزی لیکچرار کی جگہ پر وہ اپنے اثر اور رسوخ کے ذریعہ عائشہ کی تقرری کروا دیں۔ چلتے چلتے رخسانہ نے ترویدی کو یہ بھی یاد دلایا کہ ملک کی راج نیت چاہے جس کے ہاتھوں میں بھی ہو ان بیوہ کی لڑکی کی شادی جلد ہی اُتّو سے ہونے جا رہی ہے جو شری ترویدی کے دوسرے ناٹک کے منچن کی تیاری میں لگ جانے کا ارادہ کر رہا ہے۔ عائشہ کو جب ڈی.اے.وی. کالج میں تقرری ملی تو وہ اپنی بوڑھی ماں سے خوشی میں لپٹ کر رو پڑی تھی۔

اُتّو اپنے خیالوں کے سمندر سے نکل کر پھر کھڑکی کی سلاخوں کے پیچھے آ کھڑا ہوا ہے۔ عائشہ کی خوشیوں کے آنسوؤں کی اُس شام کو اب پانچ سال گزر چکے ہیں۔ اُتّو نے اب تھیٹر چھوڑ دیا ہے اور پرائیویٹ ٹی.وی. چینلوں کے چکر لگا کر تہذیب کو بازاریائے جانے کی دوڑ دھوپ میں لگا رہتا ہے، اس کی کمائی مستقل نہیں ہے جب کہ عائشہ کی تنخواہ کی پابندی پر ہی گھر چلتا ہے۔ وہ اپنے خیالوں سے نکل کر کھڑکی کے پٹ بند کرتا ہے، عائشہ کی کرسی پر آ کر بیٹھتا ہے اور بیوی کو ایک بار پھر پکار کر چائے بنانے کی فرمائش کرتا ہے، لیکن پھر کچھ سوچ کر گھر سے باہر آتا ہے۔ گھر کی دیوار کے ساتھ چل کر گھر کے چاروں طرف چکر لگا کر غور سے یہ دیکھنے کی کوشش کرتا ہے کہ فرقہ وارانہ فساد کی حالت میں بلوائیوں کے ذریعہ

Scanned by CamScanner

مکان میں آگ لگائے جانے کے امکانات کس جانب سے ہو سکتے ہیں اور اس مختصر سے مکان کی باہری ساخت میں وہ کون سی ایسی تبدیلی کی جا سکتی ہے جس سے مکان کو آگ لگایا جانا مشکل ہو جائے۔ پھر اس کی نظر اپنے اور اپنی بیوی کے نام کی تختی پر پڑتی ہے جس پر ڈاکٹر عائشہ انور کے ساتھ اس کا نام لکھا ہے۔ ناموں کو دیکھ کر وہ کچھ گھبرا سا جاتا ہے اور سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ اس تختی پر یہ کیسے ظاہر کرے کہ یہ مکان اس انور شمیم کا ہے جس نے پی.سی. ترویدی کے لکھے ناٹک ''آکرمن'' کا منچن کیا تھا۔ تختی اسے وہ دن یاد دلاتی ہے جب انُو کی ساس انُو کا سامان اٹھا کر اس گھر میں لے آئی تھی اور دروازے پر اپنے ہاتھ سے اس تختی کو کیلوں سے جڑا تھا جسے بازار سے وہ خود بنوا کر لائی تھی۔ رخسانہ نے اس وقت انُو کو بتایا تھا کہ ایک معمولی کھنڈر کی شکل میں یہ مکان اس کو اس کی سسرال سے ملا تھا اور کئی برس تک وہ اپنے شوہر کے ساتھ اس کی ٹپکتی ہوئی چھت کے نیچے برسات کی راتوں میں رہی تھی۔ بیس برسوں میں دونوں میاں بیوی نے دو کمروں کی مرمت کرا کر نئی چھت ڈلوائی تھی۔

انُو دھیرے قدموں سے چل کر واپس پھر گھر کے اندر آتا ہے، اسکی نظر اپنی بیوی عائشہ پر پڑتی ہے جو باورچی خانے میں اس کے لیے چائے بنا رہی ہے، تب اسے یاد آتا ہے کہ اس کی بیوی دروازے پر آئے ٹھیلے والوں سے سبزی خریدنے اور کیلنڈر پر دودھ اور اخبار کے ناغوں کا حساب رکھنے کے کام کے علاوہ ایک جان لیوا کام بھی کرتی ہے اور انُو کے لاکھ منع کرنے پر بھی نہیں مانتی۔ وہ انُو سے اقرار کر چکی ہے کہ ایک بے نام مگر مسلسل خوف کے دباؤ میں ہی شاید وہ انُو کی مرضی کے خلاف اس کام کو کرتی ہے اور وہ جان لیوا کام ہوتا ہے عائشہ کے پیٹ میں کبھی کبھی گھومنے والی موہوم سی کسی آہٹ کو سرکاری اسپتال کی ایبارشن ٹیبل Abortion Table پر خون کے لوتھڑوں کی شکل میں بہا دینا اور پھر عائشہ کا تھکے تھکے قدموں سے گھر واپس ہوتے وقت اپنے اس اطمینان اور خوشی کو خود سے جدا نہیں ہونے دینا کہ الگ سے عائشہ کی کوئی پہچان نہیں ہے۔ اور شہر اور محلے ٹولے کے سارے لوگ پہلے اسے انُو کی بیوی کے نام سے ہی جانتے ہیں۔

انُو کرسی پر بیٹھے بیٹھے کچن کی طرف دیکھتا ہے۔ عائشہ کچن سے انُو کے لیے چائے بنا کر کمرے میں داخل ہو رہی ہے، سامنے دیوار پر مرحوم کامریڈ رخسانہ شیشے کے فریم سے

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

اُتو کی طرف دیکھ کر گرم جوشی کے ساتھ لال سلام کررہی ہے۔ عائشہ اُتو کو چائے کی پیالی تھماتی ہے، اُتو کرسی سے لگی تیسرے کمرے کی تازہ بنی دیوار پر ہتھیلی پھیر کر ایک بار پھر میر کا شعر گنگناتا ہے ۔

عبرت سے دیکھ جس جا یاں کوئی گھر بنے ہے
پردے میں جسم ڈھے کر دیوار و در بنے ہے

(۲۰۰۳ء)

□□□

MD NADEEM IQBAL

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

تماشا گھر

جو کچھ ہوا، وہ آخر ہوا کیسے؟

میں اپنے باہری کمرے کے دروازے پر کرسی ڈالے بیٹھا تھا۔ سامنے کھلا میدان تھا۔ وہ مشرق کی طرف سے آئی تھی۔ بس ایک پرچھائیں سی۔ کوئی چیز کب کیسی نظر آتی ہے یہ بات کیا دیکھنے والے کی خود اپنی حالت پر منحصر نہیں؟ یہ سب تو میں اب بتا سکتا ہوں کہ وہ کوئی تیس برس کے آس پاس کی رہی ہوگی۔ میلے بال، گھیر دار گھاگھرا اس میں کچھ پیوند، کچھ نازک سا ناک نقشہ، رنگ سانولا جس کا نمک غالباً سخت کوش زندگی نے اڑا دیا تھا۔

میں اس وقت اپنی زندگی کے ایسے مرحلے میں تھا جب سچ پوچھا جائے تو مجھے کچھ دکھائی ہی نہیں دے رہا تھا کیونکہ وہی تو وہ منحوس لمحہ تھا جب میں نے اپنی جان دے دینے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ میں اپنی تسلیم شدہ سچائیوں اور اپنے اصولوں کے ساتھ اس دیو قامت ڈیم کی تعمیر میں مصروف سیکڑوں عملے کے درمیان اپنی ملازمت کو نہیں نبھا سکوں گا۔ میں ایک انجینئیر تھا اور ایک سسٹم کے تحت مجھے دوسروں کے ساتھ جن میں میرے افسران بھی تھے اور معاونین بھی، اپنی ذمے داریاں پوری کرنی تھیں۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ میرے سارے ساتھی یہ جانتے تھے کہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں وہ کسی اعتبار سے بھی جائز نہیں مگر وہ اس کام کو اس طرح کرتے تھے جیسے وہ ان کی پیشہ ورانہ ضرورت کا ایک جائز حصہ ہو۔ اب یہ مجھے نہیں معلوم کہ اس معاملے میں قصور میرا تھا یا دوسروں کا بہرحال اتنا تو طے ہے کہ اچھے اور برے کی تفریق کرنے کے لئے میرے اپنے کچھ معیار تھے اور میں ایسی ایمانداری کو ایمانداری اور بے ایمانی کو بے ایمانی جانتا تھا جو مجھے سکھائی گئی تھی۔ چھوٹے قد کا ایک سینئر انجینئر جو پہاڑی تھا اور میری دلیلوں پر ترس کھا کر مجھ پر مہربان رہا کرتا تھا، کئی بار مجھے سمجھا چکا تھا کہ ایماندار رہنا دراصل ایک مجبوری ہے اور لوگ عام طور پر ایماندار اس لئے رہا کرتے ہیں کہ انہیں بے ایمانی کا موقعہ میسر نہیں ہوتا۔ بہرحال بات

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

بہت بڑھ چکی تھی، برے دن قریب آتے ہیں تو بچ نکلنے کے سارے راستے پہلے ہی بند ہو جایا کرتے ہیں۔ یہ بات خاصی قوت حاصل کر گئی کہ میں راستے کا روڑا بنتا جا رہا ہوں۔ پھر اس روڑے کے ہٹائے جانے کی سازشوں کے جال کچھ اس قدر تنگ ہوتے گئے کہ مجھے لگا کہ یا تو مجھے خود ہی مر جانا چاہئے یا پھر یہ انتظار کرنا چاہئے کہ کسی دن میرے دروازے کی کال بیل بجے، میں دسترخوان پر سے نوالہ چھوڑ کر دروازے پر آؤں جہاں دو چار اجنبی لوگ میرے منتظر ہوں، وہ مجھے کسی انتہائی معقول بہانے سے کسی ویرانے میں لے جائیں اور وہاں مجھے ذبح کر کے اس طرح ڈال دیں کہ میری شناخت میں ہی خاصہ وقت لگ جائے۔ کیونکہ اب معاملات کی رفتار خاصی تیز بھی ہو چکی تھی، ہر روز کوئی نئی ذلت، کوئی نیا بکھیڑا اور کوئی نئی وارننگ سے سامنا ہو رہا تھا میرا۔

یہ درست ہے کہ میرا باپ ہر بار مجھے خط میں کسی نہ کسی بہانے اس کثیر رقم کی مجھے یاد دلا تا رہا تھا جو اس نے قرض کے طور پر میری تعلیم کے لئے وقتاً فوقتاً بڑی جوڑ توڑ کے ساتھ حاصل کی تھی۔ اسے یقین تھا کہ سارے مالی معاملات اب چٹکی بجانے میں حل ہو جائیں گے، لیکن ایسا تھا بالکل نہیں۔ دراصل میرے ساتھی بڑے چالاک تھے، پیسہ تو سب کو ہی اچھا لگتا تھا لیکن اس کو وصولنے والا وہ خود نہ بن کر مجھے آگے کر دینا چاہتے تھے، میں اتنا منجھا ہوا تو تھا نہیں، پھر گوپال انجینئر کا حشر اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔ اس کو اینٹی کرپشن والے عملے نے کیسا رنگے ہاتھوں پکڑا تھا، تھانے میں داروغہ نے آبخورے میں اپنا پیشاب گوپال کو پینے کے لئے دیا تھا۔ وہ تو آب خورہ گوپال کے منہ میں لگا بھی دیتا جب دس ہزار نقد گنوا لیے تب آب خورہ پھینکا۔ حرام کا پیسہ کس طرح لیا جائے اور اس لین دین میں خود کو محفوظ رکھ کر دوسرے کو کس طرح سے اور کن ترکیبوں سے ذریعہ بنایا جائے دراصل اسی عیاری پر وہاں کے سارے کھیل کا دارومدار تھا۔ اور میں وہاں اپنے ہم پیشہ لوگوں کے درمیان نرم چارہ سمجھ کر تاک لیا گیا تھا۔ مجھے تو وہاں زمین پر چلتے ہوئے بھی ڈر لگتا تھا۔ میری پہلی اولاد لڑکی تھی، مشکل سے پانچ برس کی ہوگی، انہیں دنوں تار آیا کہ ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ ویلور میں دکھایا جائے کیونکہ رپورٹ بڑی تشویش ناک تھی میں تو خوابوں میں دیکھنے بھی لگا تھا کہ وہ اندھی ہو چکی ہے، اس کے بعد بھی میں نے طے کر لیا تھا کہ میں سب چھوڑ

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

چھاڑ کر بھاگ جاؤں گا۔ لیکن اب مجھے لگتا ہے کہ میری یہ بات میرے ساتھیوں نے شائد پہلے ہی تاڑ لی تھی، کیونکہ مجھے تھوڑا بعد میں پتہ چلا کہ وہاں کے بڑے سے بڑے انجینئر، بابو، ٹھیکیدار اور ان ٹھیکیداروں کے زور پشت آدمی سب ایک لڑی میں پروئے ہوئے ہیں، کیونکہ کھیل کروڑوں کا تھا دس بیس جانوں کی وقعت ہی کیا تھی اور وہ سب مجھے اچھی طرح تاکے ہوئے تھے۔ مجھ تک بڑی ہوشیاری سے یہ خبر کئی بار پہنچائی بھی جا چکی تھی کہ اگر خیر چاہتا ہوں تو کبھی بھاگنے کے لئے خواب میں بھی نہ سوچوں۔ مجھے لگتا تھا کہ اگر پولیس نے زبردستی مجھے اپنے بیت الخلا کی غلیظ ہانڈی کھلانے کی دھمکی دے کر دس ہزار بھی مانگ لئے تو میں کیا کروں گا۔ میں تو خوف کے مارے اپنی تنخواہ کا لفافہ بھی کیشیر سے لیتے ہوئے ایک بار کانپ جایا کرتا تھا کہ خدا جانے اس میں کیا ہو اور باہر نکلتے ہی مجھ پر کیا گزرے۔

باہری کمرے کے دروازے پر تن تنہا کرسی ڈالے بیٹھا میں انہیں خیالوں میں غرق تھا کہ وہ سامنے آ کر کھڑی ہو گئی اور پھر جو کچھ گزرا اسے یاد کرتے ہوئے تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور حیرت ہوتی ہے کہ میں کھلی فضا میں سانس کیسے لے رہا ہوں مجھے تو جیل میں ہونا چاہئے تھا۔ کیسی شرمناک صورت حال تھی۔ ایسے پر آشوب دنوں میں جب کہ میں اپنے ہی ہاتھوں اپنی مرضی سے اپنی جان دے دینے کے لئے در پے تھا انہیں دنوں مجھے خود کی جان بچانے کے لئے کیسی کیسی جانفشانی کرنا پڑ رہی تھی۔

بظاہر ایک معمولی سا کاغذ جو اس کی گندی سی اوڑھنی کے ایک پلو میں بندھا ہوا تھا اس کے مدد سے یہ تصدیق تو ہوئی کہ وہ کس علاقے کی ہے اور پہلے کس زمین پر آباد تھی۔ جب ہلچل بڑھی تو ظاہر ہے کہ میڈیا والوں کو سن گن لگ ہی گئی، بس انہوں نے ڈھیرے ڈھیرے بال کی کھال تک ادھیڑ کر پھینک دی۔ نام رام دیئی تھی اور شوہر کا نام منسارام تھا، یہ تو اس کاغذ سے ہی پتہ لگ چکا تھا، کاغذ نے یہ بھی افشاء کر دیا تھا کہ زیر تعمیر ڈیم کے سلسلے میں سرکار کی جانب سے خالی کرائے جانے والے علاقے میں سے ایک چھوٹی آبادی والے گاؤں میں اس کی بھی جھونپڑی تھی۔ میڈیا والوں نے سراغ پا کر دیکھتے ہی دیکھتے اس مختصر سے گاؤں کے مکھیا تک کو ڈھونڈ نکالا۔ اخباروں میں سرخیاں چل پڑیں۔ ظاہر ہے کہ مکھیا نے سچ بولنے میں کوئی دریغ نہیں کیا۔ صاف صاف بیان دیا کہ رام دیئی کا شوہر جنگل

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

سے لکڑیاں بٹورتا تھا کہ ایک دن کسی آدم خور شیر کا لقمہ بن گیا۔ صرف ایک طرف کا آدھا ہاتھ جس میں چھ انگلیاں تھیں، ملا تھا جس سے گاؤں والوں نے منسارام کی شناخت کر لی تھی۔ تب ہی زور زبردستی گاؤں والوں کی اس علاقے سے بے دخلی کا پُر شور کام بھی عمل میں آنا شروع ہو گیا تھا۔ جب اخباروں نے یہ کڑیاں ملائیں تو دوسرے ہی روز بڑے بڑے انگریزی اخباروں میں وہ جماعتیں سرگرم ہو گئیں جن کا خیال تھا کہ اربوں کی لاگت سے بنائے جانے والے ڈیم دراصل غریب دشمن تعمیریں ہیں اور اس طرح کے ترقیاتی اقدام سے بڑے اور دولت مند کسانوں اور موٹے صنعت کاروں کی بھری ہوئی تھیلیوں کو اور زیادہ بھرنے کے علاوہ سرکار کا دوسرا کوئی منشا نہیں ہے اور دکھ کی بات یہ ہے کہ یہ کام غریبوں اور ناداروں کو بے گھر اور بے سہارا کر کے کیا جا رہا ہے۔

خواتین کے تحفظ اور ان کی فلاح سے متعلق تنظیموں نے تو میرا جینا ہی حرام کر رکھا تھا۔ ظاہر ہے کہ ہر بات کی وضاحت خود پولیس کو بھی مجھ سے ہی درکار تھی، اس لئے میرا ان کی حراست میں پہنچ جانا درست ہی تھا۔ ایسی ہی کسی فعال تنظیم کی دو خواتین دور دراز سے تکلیف دہ سفر کر کے اس علاقے میں جب مجھ تک ایک روز پہنچ گئیں اور انھوں نے مجھے اس طرح دیکھا جیسے کہ میں کٹہرے میں بند کوئی بھیڑیا ہوں تو اس وقت کی بے بسی یاد آ جانے پر آج بھی میں تلملا کر رہ جاتا ہوں۔ مجھے اب یہ تو یاد نہیں کہ ان خواتین نے مجھ سے کتنی بار ملاقات کی لیکن ان کے سوالات مجھے غصے اور شرم سے پسینے پسینے کر دیتے۔ دیکھا جائے تو ان کا یہ عمل زیادہ بے جا بھی نہ تھا۔ لیکن مجھے حیرت یہ تھی کہ آخر وہ میرے کسی بھی جواب پر اعتبار کیوں نہیں کر رہی تھیں۔ ان میں سے ایک عورت جس کے بال کٹے ہوئے تھے اور جو نیلی جینس پہنے تھی اور غالباً خاصہ قیمتی گوگل آنکھوں پر لگائے تھی کچھ زیادہ ہی بے باک تھی۔ پتہ لگا کہ وہ خواتین کی کسی انگریزی میگزین سے تعلق رکھتی تھی۔ اس نے تو کچھ چھوڑا ہی نہیں، میرا نام، میری ذات میرے باپ کا پیشہ، مکان، جائداد سب پوچھ ڈالا۔ پھر اس طرح کے سوالات بھی کہ میری شادی ہو گئی ہے یا میں کنوارا ہوں، بچے کتنے ہیں اور وہاں میں اکیلا کیوں رہتا ہوں، میری بیوی بچے ساتھ کیوں نہیں رہ رہے ہیں اور مجھے اپنی ذمےداریوں کے سبب بیوی سے کتنے عرصے تک دور رہنا پڑتا ہے۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ اس نے دوسروں سے یہ

Scanned by CamScanner

بھی معلوم کیا تھا کہ میں شراب پیتا ہوں یا نہیں اور کیا میں عورتوں کا پرانا شکاری ہوں۔

عجیب وقت تھا۔ اخباروں میں رام دیئی کی پوری تصویر جس میں پوری صورت حال کی وضاحت شامل تھی، چھپی تو اس کے برابر میری تصویر بھی موجود تھی۔ یہ خبر سن کر میری سیدھی سادی بیوی کی نڈھال کیفیت اور اسی حالت میں میرے ڈیڑھ برس کے بچے کو بھوک پیاس کی نقاہت میں سنبھالنے کا احوال جن لوگوں نے بعد میں مجھے بتایا تھا اس سے میں اندازہ کر سکتا ہوں کہ اس پر کیا گزری ہوگی۔

ایک بڑی الجھن یہ بھی تھی کہ پولیس کو پورا یقین تھا کہ میرے بیانات مہمل ہیں۔ ان لوگوں نے مجھے ایذا پہنچانے کے لئے اپنا ذہن تیار بھی کر لیا تھا کیونکہ ایک بڑے کڑوے اور تیکھے تیوروں کے ساتھ مجھ سے یہ کہا گیا تھا کہ سچ قبول کر لینے کا مجھے ایک آخری موقعہ اور دیا جا رہا ہے مگر میری بے بسی بھی عجیب تھی کہ میرے پاس انہیں کچھ نیا بتانے کے لئے تھا ہی نہیں۔ ظاہر ہے کہ میں نے پھر وہی کہا جو کہتا چلا آرہا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ پولیس بھی باہری دباؤ اور خاص طور پر سیاسی دباؤ کے سبب الجھن میں تھی کیونکہ سرکار وہاں کے علاقے کے ووٹروں کا شمار کر کے معاملے میں ایک خاص رخ کے ساتھ دلچسپی لے رہی تھی، پھر ایک پریشانی یہ بھی پیدا ہو گئی تھی کہ وہ سماجی تنظیمیں جو عام خوشحالی اور ترقی کے نام پر مجبوروں اور ناداروں کے گھربار اجاڑنے کے سخت خلاف تھیں ان کے دلائل کی مدد لے کر سرکار مخالف سیاسی جماعتیں بھی طوفان اٹھانے میں لگ گئی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ایک علاقے سے غریبوں کو اٹھا کر دوسرے انجان اور اجنبی علاقے میں بے سروسامانی کی حالت میں پھینک دیئے جانے سے ان غریبوں کے گھربار ہی نہیں چھنتے بلکہ ایک مخصوص علاقے سے منسوب ان کا پشتینی پیشہ بھی چھین لیا جاتا ہے۔ مخالف جماعتوں کے لیڈر بھلا وہ موقعہ کیوں گنواتے، حرکت میں آتے ہی انہوں نے پتہ لگا لیا کہ رام دیئی کے ساتھ کیا ظلم ہوا تھا۔ بے دخل لوگوں کو معاوضہ دیئے جانے یا نئے علاقے میں بسائے جانے کے معاملے میں دلالوں کی کھلی لوٹ کی انہوں نے قلعی کھول کر رکھ دی۔ رام دیئی کے مفلوک الحال، نابینا اور ضعیف چچا کو انہوں نے ٹی.وی پر پیش کر دیا جس نے لوگوں کو بتایا کہ وہی بے دخل کیے گئے لوگ سرکار سے معاوضہ یا زمین کا پٹہ حاصل کر پا رہے ہیں جو دلالوں کی کمیشن کی پیشگی رقم ادا

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

کرنے کی حالت میں ہیں۔ رام دیئی جس دلدل کے کنارے لاکر ڈالی گئی تھی۔ وہاں کی جھاڑیاں صاف کرنے میں اس کے آٹھ برس کے بچے کو کوڑیالے سانپ نے ایسا ڈسا کہ بغیر ڈاکٹر والے اسپتال سے مرکر ہی نکلا لیکن وہ تب بھی ہمت نہ ہاری مگر جب دفتروں کے چکر لگاتی تو دلال اسے گھیر لیتے اور افسران کو کھلانے پلانے کے لئے کم سے کم دو ہزار روپے کا مطالبہ کرتے۔ اسی نابینا کا یہ کہنا تھا کہ رام دیئی کو یہ امید تھی کہ وہ اپنے ہاتھوں بٹی ہوئی مونج کی رسی بیچ کر شائد کچھ مہینوں میں مطلوبہ رقم جمع بھی کر لے گی۔

میری بدقسمتی یہ تھی کہ باز پرس کی ابتدائی منزل میں ہی بات اس قدر گنجلک بن گئی کہ پولیس کا مجھ پر سے شک ہٹا ہی نہیں۔ اب میں بھی پولیس کو کیسے سمجھاتا کہ رام دیئی میرے پاس اس وقت رسی بیچنے آئی تھی جب مجھے اپنی دنیا میں ہر طرف اندھیرا ہی نظر آرہا تھا۔ میرے لئے انہیں یہ سمجھانا مشکل تھا کہ جو پیشہ اختیار کرنے کے لئے میں نے کیسی کیسی پریشانیوں کے بعد ڈگری حاصل کی تھی اور جس کے علاوہ میں کوئی دوسرا کام یا پیشہ اختیار کرنے کے لائق ہی نہ رہ گیا تھا وہی پیشہ میری جان کا دشمن بن گیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ قول کہاں تک صحیح ہے کہ آدمی بس کسی خاص لمحے اور کسی مخصوص ذہنی دباؤ کی حالت میں ہی خودکشی کرسکتا ہے، ہمیشہ نہیں۔ بہر حال اس وقت مجھے کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا، ہاں اتنا ضرور تھا کہ رام دیئی کے ہاتھ میں رسی دیکھ کر ایک بار مجھے یہ ضرور لگا تھا کہ قدرت بھی شائد خود میری مدد کررہی ہے۔ لیکن میں نے اس کے ہاتھ میں جو رسی دیکھی تھی وہ زیادہ موٹی نہ تھی تو میں نے اس سے کہا کہ مجھے ذرا مضبوط رسی درکار ہے۔ یہ سن کر اس نے تیزی سے رسی کو ایک اسٹول کے سہارے کمرے کی چھت کے کنڈے میں بھی ڈال دیا اور نیچے سے اس کے دونوں سروں کو باندھ کر ہاتھوں سے جھٹکا دے کر مجھے رسی کی مضبوطی کا بھروسہ بھی دلانا چاہا۔ مگر میں نے رام دیئی سے صاف کہہ دیا کہ رسی اتنی مضبوط نہیں جیسی مجھے ضرورت ہے۔ لیکن رام دیئی کچھ مایوسی کے ساتھ مجھے ہر طرح سے رسی کی مضبوطی کا یقین بھرے ہوئے گلے اور رندھی ہوئی آواز میں دلاتی رہی مگر آخری بار اسے خریدنے سے منع کرکے اور اس سے پیچھا چھڑانے کی خاطر میں باہری کمرے سے اٹھ کر اندر باتھ روم میں چلا گیا، تھوڑی دیر بعد یہ سوچ کر کہ وہ چلی گئی ہوگی واپس آیا تو غصہ بھی آیا کہ وہ گئی نہیں

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

تھی۔ میں یہ سوچ کر بددل بھی ہوا کہ وہ اپنے افلاس اور بے سروسامانی کا واسطہ دے کر اور بچوں وغیرہ کے فاقوں کی داستان سنا کر مجھے دیر تک پریشان کرتی رہے گی۔

کیسی بے بسی ہے۔ پتہ نہیں کہ رام دیئی کے پاس کونسی ایسی طاقت تھی، اب سوچتا ہوں تو شرم آتی ہے کہ غالباً میں کھیل کے میدان کا زیادہ شاطر کھلاڑی تھا کیونکہ رام دیئی تو مجھے بس اتنا بتانے کے لئے اس کمرے میں میرا انتظار کر رہی تھی کہ جس رسی کو میں اپنے لئے کمزور سمجھ رہا تھا وہ اس کے لئے کتنی مضبوط تھی کہ اس کے پورے بدن کو ہوا میں سنبھالے تھی۔

(۱۹۹۹ء)

□□□

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

بے صورتی کی صورتیں

صورت از بے صورت آید در وجود
ہم چناں کز آتشے زاداست دود

(رومی)

وہ معمول کے خلاف جلدی جلدی روزانہ کی ڈاک دیکھ رہے تھے۔ ڈاک میں ایک عام سا لفافہ بھی تھا جسکے داہنے کونے پر سیاہ روشنائی سے انگریزی حرف میں ترلوچن سنگھ لکھا ہوا تھا اور ترلوچن کا (T) سیدھی تلوار کی طرح بنایا گیا تھا۔ ہوٹل کلینگ کے مالک سے ملاقات کا وقت ہو چکا تھا اس لئے انہوں نے لفافہ بعد میں کھولنے کے لیے میز پر چھوڑ دیا، حالانکہ اُس غیر متوقع لفافہ نے ان کا اشتیاق بڑھا بھی دیا تھا۔

ہوٹل کلینگ والی بیٹھک میں اصل معاملہ وہیں آ کر کھٹائی میں پڑ گیا جہاں ایک بار پہلے بھی پڑ چکا تھا۔ باورچی خانے کا سپروائزر چاہتا تھا کہ ایوب میاں اب مال بیچتے وقت چار پیسے اسے بھی کمانے کا موقعہ دیں ورنہ وہ آئے دن انکے مال میں مین میخ نکالا کریگا۔ ایوب میاں جب حساب لگاتے تو سپروائزر کے چار پیسے بھاری بھرکم رقم کی شکل میں ان کے سامنے آ کھڑے ہوتے۔ پھر بات وہاں آ کر اڑ جاتی کہ سپروائزر اس بوجھ کو کم کرنے کے لئے جوترکیب بتا تا وہی تھی جو بعض ہوٹلوں میں رائج تھی، یعنی مردہ خوری۔

ایسا نہیں تھا کہ ایوب میاں کوئی کٹر شرعی نمازی آدمی تھے۔ لیکن پہلے بھی ایسا ہو چکا تھا کہ وہ سپروائزر کی تجویز پر گھر آ کر بے چین نیند سوئے تھے۔ ممکن ہے اس کا سبب یہ رہا ہو کہ وہ فطرتاً حساس کچھ زیادہ ہی تھے لیکن سب سے زیادہ دخل ان کے معاملات میں غالباً ان کی اُس ذہنی تربیت کو تھا جو خاصے سنجیدہ ماحول میں ہوئی۔ وہ چالیس ۴۰ پینتالیس کی پکی عمر کو پہنچ چکے تھے اور اس درمیان وہ باپ کی شفقتوں اور نگرانی سے کبھی دور نہ رہے۔ اس عرصے میں جہاں باپ نے اپنے بیٹے کے دل میں اپنی اخلاقیات کا تصور پکا

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

کر دیا تھا۔ وہیں کچھ اور بھی عجیب سی باتیں ان کے دل میں بٹھا رکھی تھیں، مثلاً یہ کہ صورت جس چیز سے پیدا ہوتی ہے اس کی کوئی صورت نہیں ہوتی۔ ایوب میاں کے قول کے مطابق ان کے بزرگوں نے یہ تلاش کرنے میں صدیاں گزار دیں تھیں کہ خود وہ بے صورت شے کیا ہے جس سے کوئی صورت پیدا ہوتی ہے۔ ہوٹل کے سپروائزر نے جب انہیں حرامخواری کی ترغیب دے کر دو ایک بار ان کی نیند خراب کی تو انہیں اس پر غصہ تو نہ آیا مگر ان کے جی میں یہ ضرور آیا کہ وہ اس کو بتائیں کہ وہ کون ہیں اور ان کے پردادا کے دادا نصرت علی خاں اہلکار کی تاریخ کیا تھی۔ ایوب میاں کی چھوٹی موٹی تاریخ کا معاملہ یوں تھا کہ ان کے جدِ امجد نصرت علی خاں پرانے زمانے میں کسی صوبیدار کے نامی گرامی جاگیردار شتی خاں کے اہلکار تھے۔ شتی خاں عام جاگیرداروں سے خاص طور پر مختلف تھے وہ ان ضدی لوگوں میں سے تھے جنہیں اپنی تاریخ میں اگر جگہ نہ ملتی تو وہ تاریخ میں قائم رہنے کے لئے کسی بھی دوسری تاریخ میں گھس جایا کرتے۔ شتی خاں کو رعایا کی خبر گیری اور ناداروں کی دادگری کا بھی خیال رہا کرتا تھا اس لئے وہ اپنے علاقے میں خود رات کو گشت کیا کرتے۔ ایسے موقعے پر وہ ان زہریلے اور قاتل بچھوؤں کو جنہیں انہوں نے بڑے رکھ رکھاؤ سے پال رکھا تھا ہمیشہ کل دار ڈھکنوں والی ڈبیوں میں اپنے ساتھ رکھتے۔ وہ رات کے تیسرے پہر کو جا کر کے گھروں کی کھڑکیوں پر کان لگا کر اندر کی آوازیں سنتے اور جس گھر میں انہیں شک ہوتا کہ بچھو کا استعمال ضروری ہے دوسرے دن اس گھر کی کنڈی کھٹکھٹاتے۔

صاحب خانہ پوچھتا

''کون۔۔۔؟''

جواب دیتے۔ ''شتی خاں''

یہ ناممکن تھا کہ آواز سن کر صاحب خانہ سہمی ہوئی حالت میں باہر نہ آئے۔ اس کے وارد ہونے پر سوال کرتے۔

''سنا ہے تو راتوں میں دیر تک جاگتا ہے؟''

''ہاں حضور نیند نہیں آتی۔'' وہ گھبرا کر اقرار کرتا۔

شتی خاں دو پل اسے شفقت بھری نگاہ سے دیکھتے پھر گلے سے موتیوں کا ہار اُتار

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

اکر صاحب خانہ کی جانب بڑھتے اور دل ہی دل میں وہ فقرے دہراتے جو وہ ایسے ہی موقعوں پر پہلے بھی دہرا چکے تھے۔ نیند تیری ہی نہیں میری بھی غائب ہے، موتیوں کا ہار تو شفق خاں کو کبھی بھی مل جائے گا مگر یہ زندگی پھر نہ ملے گی اس لئے گلے میں یہ ہار ڈالو اور جیب میں ایک بچھو تا کہ جب تو ہار جیب میں رکھنے کے لیے ہاتھ ڈالے تو یہ اپنے مہربان ڈنک کی ایک چبھن سے تجھے میٹھی نیند کے ساتھ ہمیشہ کی نیند سلا دے۔ تو خود ہی انصاف کر، اس سے زیادہ وہ دلداری اور غمگساری، شرافت اور انکساری شفق خاں کسی کے ساتھ اور کیا کر سکتا ہے۔

پھر شفق خاں صاحب خانہ کو موتیوں کا ہار پہناتے بغلگیر ہونے کے بہانے چپکے سے ڈبیا کا کلدار ڈھکنا کھول کر بچھو کو صاحب خانہ کی جیب میں ڈالتے رات میں اسکے گھر آ کر اسکی نیلی پڑی لاش کے قریب بیٹھے پس ماندگان سے زندگی کی بے ثباتی کا رونا روتے اور انہیں آلام روزگار کی سختیوں کو جھیلنے کے لیے صبر کی تلقین کرتے۔

اس طرح کے سانحے جب بار بار ہوتے ہیں تو شفق خاں ایک رات خواب میں پھر اس نا موجود فقیر کو دیکھتے ہیں جس نے ایک بار سڑک کے کنارے شفق خاں کے گھوڑے کی لگام پکڑ لی تھی اور اسکی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے اسے گھورتا رہا تھا۔ شفق خاں نے سر اٹھا کر اس سے دریافت کیا تھا کہ وہ اسکی آنکھوں میں کیا دیکھ رہا ہے۔

فقیر نے سوال کیا تھا۔

''بول تجھے کتنی دولت اور کتنا جاہ و حشم درکار ہے۔'' شفق خاں مسکرایا تھا۔

''ہر امیر کی طرح مجھے دونوں چیزیں زیادہ سے زیادہ درکار ہیں۔''

''کیا بک رہا ہے کم بخت۔'' فقیر سر پیٹ کر چیخا تھا۔

''کسی بھی زردار سے پوچھ دولت کبھی بہت نہیں ہوتی ہمیشہ کم رہتی ہے، یہی کیفیت جاہ و حشم کی ہے۔'' شفق خاں نے لگام کو جھٹکے دے کر، گھوڑے کو ایڑ ماری تھی اور یہ کہتے ہوئے گرد اڑاتا اپنی راہ پر ہولیا تھا کہ جو بادشاہوں کا مقدر ہے وہ بادشاہوں کو ملتا ہے فقیروں کو نہیں۔ مگر! اس غبار کے پیچھے اس فقیر کی صدا بھی اسکا پیچھا کر رہی تھی۔

''یاد رکھ تو نے وہ چاہا ہے جو تجھ سے اس مہربان زمین پر پوری زندگی خوف کی کھیتی کرائے گا۔''

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

شقی خاں صبح کو پریشان سا اٹھتا ہے معتبر کو بلا کر خواب بیان کرتا ہے۔ معتبر خواب کی تعبیر دیتا ہے کہ شقی خاں کی پرجا میں اب بھیڑوں کی کھالوں میں کچھ بھیڑیے موجود ہیں۔ شقی خاں ایک بار پھر اس ناموجود فقیر پر دانت پیستا ہے اور جھنجلا کر جاگیر کے جہاندیدہ اہلکار نصرت علی خاں کو طلب کرتا ہے اور بہتری کی تدبیر پوچھتا ہے۔۔

نصرت علی خاں فقیروں اور مجذوبوں کی قدم بوسی میں بیٹھنے والا نفس کی غلامی سے بے بہرہ جھنجلا اور موٹے چھوٹے چار جوڑوں میں برس کاٹنے والا جاگیر کا نمک خوار تھا۔ بھاری دل سے ایک بار پھر سے جاگیر کی دبی کچلی سراسیمہ رعایا کو شقی خاں کے عذاب سے بچانے کے جتن میں رازداری کے ساتھ جاگیر کے مشائین کا جلسہ منعقد کرتا ہے۔

ان حاضرین میں لبادہ اوڑھے بکھرے بالوں والا ایک نابینا، چاک گریبان، گردن جھکائے ایک کونے میں گم سُم بیٹھا تھا۔ نصرت علی خاں نے حاضرین کے سامنے ادب کے ساتھ کھڑے ہو کر شقی خاں کا خواب بیان کیا اور یہ بھی عرض کیا کہ تدبیر بتانے کے لئے بڑی مشکل سے مہلت دی گئی ہے۔ بات ختم ہوئی تو سب کی نگاہیں درمیان میں دوزانو بیٹھے ایک بزرگ پر جا ٹھہریں وہ بزرگ کچھ توقف کے بعد اپنی جگہ پر کھڑے ہو کر حاضرین کو نظروں سے ٹٹولنے لگا پھر یوں کلام کیا۔

''کسے معلوم ہے کہ مہلت دینے کا خطرہ کون اٹھا سکتا ہے؟''

مشائین کے ایک جانب سے ایک حکیم نے بات چلائی۔

''جو انتظار کی قوت پہچانتا ہو۔''

کچھ لمحہ استدلال ہوا پھر سوال اٹھا.....

''انتظار کس کی تحویل میں ہے؟''

درمیان سے آواز اٹھی....

''وقت کی تحویل میں۔ کہ وقت کے بغیر انتظار اور انتظار کے بغیر وقت محض ایک خلا ہے۔''

بزرگ نے حاضرین کو یاد دلایا کہ ایک بار مجلس نے خاصا وقت اس تلاش میں صرف کیا تھا کہ وقت کی سب سے بڑی اساس کیا ہے؟ کیوں نہ اس حاصل کی ایک بار پھر

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

یاددہانی کرادی جائے۔ایک بھاری بھرکم مگر دبی دبی سی آواز نے یاددلایا۔
''وقت کی سب سے بڑی اساس امید ہے۔کہ امید وقت میں جان ڈال دیتی ہے۔''

یہ سن کر بزرگ کی آنکھیں چمک اٹھیں،اس نے اعلان کیا....
''شاید اسی سبب ہم اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ جس کے پاس وقت نہیں وہ منتظر نہیں اور جسکے پاس انتظار نہیں افسوس کہ وہ امید سے خالی ہے اس لئے مہلت کو چھین کر امید کو کمزور کردینا ہی عین تشدد ہے۔''

''بے شک''،سب یک زبان ہو کر بولے۔
بزرگ نے چاروں طرف نگاہ کی اور حاضرین کو یہ یاد کرانا چاہا کہ شقی خاں کے خواب نے ایک بار پھر یہ سوال اٹھادیا ہے کہ تشدد کی صورت کس بے صورت شے سے بیدار ہوتی ہے۔اوراس سلسلے میں حکما کا موقف کیا ہے۔بزرگ نے فوراً وضاحت کی
''تشدد کی صورتیں خوف سے پیدا ہوتی ہیں اور خوف کی کوئی صورت نہیں ہوتی
''اگر خوف تشدد کا ضامن ہے تو پھر حق کدھر ہوگا؟''
محفل میں کچھ دیر خاموشی رہی پھر کونے میں بیٹھے نابینا نے جواب دیا...
جدھر ہم آہنگی ہوگی۔''
''اور ہم آہنگی کدھر ہے''۔
جدھر بے خوفی،انتظار اور مہلت کا آہنگ ہے۔''
جلسہ برخاست ہوا۔نابینا نے نصرت علی خاں کو گلے لگایا اور وقت رخصت سرگوشی کی....''تیرا دانا پانی یہاں سے اٹھ چکا ہے۔شقی خاں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہہ دے کہ جب امید ضعیف ہو جائے تو دنیا میں سمندر کی طرح تین حصہ خوف اور خشکی کی طرح ایک حصے بے خوفی رہ جاتی ہے افسوس کہ مہلت اب خوف میں بدل چکی ہے۔''
نصرت علی خاں کو اپنا انجام تو پہلے ہی معلوم تھا،ہاتھ باندھ کر بس شقی خاں کو ان لفظوں کے ساتھ باور کرانا چاہتا تھا!
''اے حاکم جس طرح اس سرزمین پر تین حصے پانی اور ایک حصہ خشکی ہے اسی

www.urduchannel.in

طرح انسان کی زندگی میں تین حصے خوف اور ایک حصہ بے خوفی ہے۔ جیسے جیسے تمناؤں کی تابنا کی اپنی ہم آہنگی سے گریز کرتی ہے ویسے ویسے حرارت کا درجہ بڑھتا ہے۔ اور ظلم کی برف پگھل کر خوف کے پانیوں کی سطح بلند کرتی جاتی ہے اور بے خوفی کی خشکیاں غرقاب ہوتی جاتی ہیں۔''

نصرت علی خاں کی یہ تقریر پوری ہوتی ہے۔ شفقی نصرت کو مال و دولت سے نوازتا ہے اور اسکے بڑے بیٹے کو یرغمال کے طور پر اپنے پاس رکھ کر اور نصرت علی خاں کے سر پر خوف کی ایک تلوار لٹکا کر جاگیر سے باہر نکال دیتا ہے اور نئے اہلکار کو حکم دیتا ہے کہ شفقی خاں کے یکا یک فوت ہو جانے کا اعلان جاگیر میں کرا دے۔ اور خود ایک باپردہ پالکی میں چھپ کر اعلان کا لوگوں پر رد عمل دیکھنے کے لئے موجود رہتا ہے۔ اور اعلان پر خوشی سے جھومنے والوں کے چہرے یاداشت میں محفوظ کر کے دوسرے دن انہیں گھروں سے گھسیٹ کر باہر نکلواتا ہے اور ان کے اعضائے تناسل سلوں پر رکھ کر کے بھاری بٹوں سے قیمہ قیمہ وا دینا کر دیتا ہے اور انکے دروازوں پر یہ فقرہ لٹکوا دیتا ہے

''اقتدار کی دنیاداری کے بغیر اقتدار ممکن نہیں۔''

پھر ایک دن ایسا بھی آتا ہے جب شفقی خاں واقعی مر جاتا ہے۔ رعایا شفقی خاں کے جنازے کے چاروں طرف سینہ کوبی سے چھاتیاں لہولہان کر لیتی ہے۔ لیکن شفقی خاں انہیں انعامات دینے کے لئے پھر سے زندہ نہیں ہوتا مگر ڈری ہوئی عام رعایا شفقی خاں کو نہلاتی ہے، کپڑے پہناتی ہے، مسند جاگیر پر بیٹھاتی ہے۔ مگر شفقی خاں پھر بھی زندہ ہونے پر تیار نہیں ہوتا۔ وہ مسند پر بیٹھا سڑتا گلتا رہتا ہے مگر ڈرے ہوئے لوگ اپنی ناکوں پر رومال رکھ کر مرے ہوئے شفقی خاں کی تعظیم بجالاتے ہیں اور نذریں گزارتے ہیں اور نصرت علی خاں کا بیٹا جسے پھر باپ کی کوئی خبر نہ ملی تھی سارے بدن سے لرزتا ہوا زانوؤں میں سر ڈالے روتا ہے کہ نصرت علی خاں نے رخصت کے وقت اس سے کہا تھا کہ جان پدر جو ڈرتا ہے وہ ڈرا ہوا ہے، اسلئے حق سے پرے ہے، الہٰذا وہ شفقی خاں ہے اور مردہ ہے۔

انہیں خانماں برباد نصرت علی خاں کا خون میاں ایوب علی خاں میں دوڑ رہا تھا۔

کاروباری کاموں سے فراغت پا کر اپنی میز پر جب ایوب میاں بیٹھے تو انہیں

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

ترلوچن سنگھ کا بند لفافہ سامنے پڑا دکھائی دیا۔ انہوں نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ اپنی روزی روٹی کی جدو جہد میں زندگی انہیں کیسے کیسے لوگوں سے ملائے گی۔ دراصل ایوب میاں کے گھرانے کا نقشہ ہی کچھ اور تھا باپ عربی فارسی کے مشہور عالم تھے۔ محبت سے مجبور باپ نے اپنے اثاثے کا بڑا حصہ ایوب میاں کو کاروبار سے لگانے کے لئے داؤں پر لگایا اس طرح ایوب میاں نے برائلر (BRILER) کا ایک پولٹری فارم کچھ بیگہ زمین خرید کر اور اس پر بینک کا قرض لے کر بڑی جانفشانی کے بعد کھڑا کرلیا۔ کچھ آگے بڑھے تو قرضے کے لئے بچی کچھی موروثی جائداد بینک کو گروی رکھنا پڑی۔ اب ایوب میاں کو اُونگھتی ہوئی مرغیوں کا پیٹ چاک کر کے اور بیماری کی علامت کا پتہ لگا کر دوسری مرغیوں کو مرنے سے بچانے کے لئے ڈاکٹر کو بلانا پڑتا ہے۔ شہر سے دور بسے فارم میں آئے دن بجلی خراب ہوجانے کے سبب ٹیوب ویل کے کام نہ کرپانے اور پانی کی تنگی کے سبب جاڑے کی آدھی رات میں موٹر سائیکل پر بیٹھ کر میونسپل کارپوریشن سے رابطہ قائم کر کے پانی کا ٹینکر راتوں رات پہنچا کر ٹنکی کو بھروانا پڑتا ہے۔ پھر صبح کا سورج نکلنے بھی نہیں پاتا کہ فارم پر مرغ خریدنے بازار کے ایجینٹ آٹو پر سوار آدھمکتے۔ ایوب میاں ان کے حساب کتاب کے رجسٹر مال دینے سے پہلے کھول کر دیکھتے تو لگتا کہ انہوں نے پچھلے خریدے ہوئے مال کی اُدھاری ابھی تک ادا نہیں کی ہے۔ کسی پر دس ہزار تو کسی پر آٹھ ہزار باقی ہیں۔

ایوب میاں کی زندگی کا یہ واقعہ جس نے انہیں سنبھالا دیا ان کے گھر کی سامنے والی سڑک کا ہے۔ جس پر ایک ٹرک والے نے ایک موٹر سائیکل سوار کو ٹکر دی اور بھاگ نکلا۔ ایوب میاں فطرتاً نیک دل تھے اور گھریلو تربیت بھی خدا ترسی کی تھی اس لئے بے چین ہو کر آناً فاناً سڑک پر پہنچے اور ایک رکشے والے کی مدد سے بے ہوش، موٹر سائیکل سوار کو رکشے پر لادا اور اسپتال پہنچ گئے خوش قسمتی سے اس زخمی کو رات کے تیسرے پہر ہوش آیا تو ایوب میاں سرہانے ہی بیٹھے تھے۔ سائیکل سوار کا نام سدانند کھرے تھا وہ شہر کے ایک اعلیٰ درجے کے ہوٹل میں ہیڈ کک تھا۔ کھرے اسپتال سے صحت یاب ہو کر گھر آیا تو ممنونیت کے جذبے سے ایوب میاں کا اتنا غلام ہوا کہ ان پر جان چھڑکنے لگا۔ کیونکہ ڈاکٹروں کے مطابق وقت پر ملنے والی طبی امداد نے کھرے کو نئی زندگی دی تھی۔ میل ملاقات کے دوران جب

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

کھرے کو ایوب میاں کی کاروباری الجھنیں اور پریشانیاں معلوم ہوئیں تو ایوب میاں کو شہر کے کسی موزوں علاقے میں چکن فاسٹ فوڈ کی دوکان کھولنے کا مشورہ دیا اور وعدہ بھی کیا کہ وہ فاسٹ فوڈ کی ایسی ٹریننگ پکانے والوں کو مہیا کرے گا جس سے بے مثال ذائقے کی چیزیں تیار ہو سکیں۔ مرغ گھر کے تھے، ذائقہ کا ایک خاندانی شعور ایوب میاں کی زبان پر بھی تھا، جی کڑا کر کے دوکان لے لی۔ اس وقت شہر میں شاید ہی کوئی ایسی دوکان تھی۔ سد انند نے وعدہ نبھایا اور ذائقہ لوگوں کو کچھ ایسا منہ لگا کہ کاروبار چل نکلا۔ انہیں دنوں ایوب میاں ایک اور حادثے سے گزرے، ہوا یہ کہ ایک شام علاقے کے تھانہ انچارج کی بھاری موٹر سائیکل ایوب میاں کی دوکان پر آ کر رکی۔ پیچھے ایک کانسٹیبل بھی بیٹھا تھا۔ دونوں کلف دار وردی میں تھے۔ تھانیدار کی کمر میں پستول تھا اور سینے پر کارتوس کی پیٹی۔ اگلا منظر اس طرح ترتیب پاتا ہے۔ کانسٹیبل کاؤنٹر پر بیٹھے ایوب میاں کو اشارے سے ایک طرف بلاتا ہے۔ ایوب میاں فکرمند سے دوکان سے اٹھ کر جاتے ہیں۔

''کل سویرے تھانے پر آ کر ملو''۔ تھانیدار کی بھاری آواز ایوب میاں کے کانوں سے ٹکراتی ہے۔

''کیا ہو گیا'' ایوب میاں سٹپٹا کر پوچھتے ہیں۔

''گاڑیاں من مانے طور پر پارک ہوتی ہیں، راستہ بند ہو جاتا ہے۔ رپورٹ ہے کہ کھانے کے ساتھ شراب بھی تمہارے چھوکرے گاڑیوں میں پہنچاتے ہیں۔ دوکان کی چھت جرائم پیشہ لفنگوں کا اڈہ بن رہی ہے۔''

کسی جواب کا انتظار کئے بغیر موٹر سائیکل شور کرتی ہے، کانسٹیبل اچک کر پیچھے بیٹھتا ہے، ایوب میاں جاتی ہوئی موٹر سائیکل کا دھواں نتھنوں میں لئے ان جھوٹے اور من گڑھت الزامات پر اپنی جگہ ہکا بکا رہ جاتے ہیں۔ ذرا دیر بعد انہیں بتایا جاتا ہے کہ اس تھانے دار کا نام تر لوچن سنگھ ہے۔

ایوب میاں شاید زندگی میں پہلی بار کسی بڑے تھانے کو اندر سے دیکھ رہے تھے۔ درمیانی حصہ میں لکڑی کی پرانی وضع کی ایک میز جس پر میلا سا میز پوش بچھا تھا اور آس پاس ہی کچھ مرمت شدہ پرانی کرسیاں پڑی تھیں ان پر تر لوچن سنگھ دو تین لوگوں کے ساتھ بیٹھا ٹھٹھے

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

لگا رہا تھا۔ میز پر چائے کے چھوٹے گلاس پڑے تھے جن پر موٹے بدن والی ڈھیٹ مکھیاں بھنک رہی تھیں۔ ترلوچن نے ایوب میاں کو دیکھا تو دور سے ہی آیئے آیئے! کی صدا بلند کی۔ اوران کے بیٹھنے کے لئے خود ہی ایک کرسی سیدھی کی۔ ایوب میاں اس برتاؤ کے لئے آمادہ نہ تھے۔ ابھی ایوب میاں بیٹھ بھی نہ پائے تھے کہ ترلوچن دوسرے کی بات ادھوری چھوڑ کر ایوب میاں کو بتانے لگا کہ پچھلا ٹی.آئی.ان کے خلاف فائل تیار کروا رہا تھا۔ سیاسی پارٹیوں کے اوباش قسم کے مقامی کارکن لونڈوں کے ذریعہ ایوب میاں کی دوکان کی شکایتیں پارٹی کے لیٹر پیڈوں پر لکھوا کر رکھ رہا تھا۔ یہ لونڈے پولیس کی مخبری کا کام بھی کرتے تھے اس لئے ایوب میاں کو چاہئے کہ وہ جب بازار میں آ کر بیٹھ ہی گئے ہیں تو پولیس کو ساتھ لے کر چلیں۔ پھر ترلوچن نے ایوب میاں کے لئے چائے منگوائی اور دوسروں سے یکا یک مخاطب ہو گیا۔ ''ہم تو صفائی کے داروغہ ہیں، ہاتھ میں جھاڑو پنجہ ہے۔ زمانے کے ساتھ جو آرہا ہے اسے ہمارا باپ بھی نہیں روک سکتا لیدوہ کرتا ہے اسے ہم صاف کرتے ہیں۔'' پھر ترلوچن نے ایوب میاں کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بیان کیا۔

''یہ سالی تھانیداری ہے؟ آج نئی ردھتیک ویوستھا کی لید اٹھاؤ، کل نئے ردھتیک سنگھرش کا ملبہ سمیٹو۔ ایس. پی. صاحب کہتے ہیں، تم لوگ گدھے ہو۔ اب انگریزوں کے زمانے کی گالی تیری ماں کی، بکنا چھوڑ دو ایسی گالیاں پھول بن چکی ہیں۔ دیش کا سب کانشس (SUBCONCIOUS) بدل رہا ہے اور چبھنے والی گالیاں وہیں سے نکلتی ہیں۔''

ایوب میاں تھانے کی یادوں سے باہر نکلے تو ان کے سامنے میز پر رکھا وہ لفافہ پھر موجود تھا جس کے ایک کونے پر ترلوچن سنگھ کا (T) کسی سیدھی تلوار کی طرح بنایا گیا تھا، ایوب میاں کو یاد آیا کہ ترلوچن سنگھ نے کیسے اپنے ساتھ اپنے چند دوستوں کے بڑے تقاضوں کے بعد ایوب میاں کے فارم پر دعوتیں کرائی تھیں اور انھیں موقعوں پر پینے پلانے کے دوران اس نے بتایا کہ اس کا جغرافیہ زمین کے اس حصہ پر قائم تھا جہاں ٹیلے تھے ندیاں تھیں اور پڑوس میں گھنے جنگل تھے جن میں تیر اور کمان لوگ اپنے ہاتھوں اور اپنی محنت سے بناتے تھے اور جن کی تیاری میں ان کا آبائی فن شامل تھا اور ان کے نشانے سے بے مثال ارتکاز پر قائم تھے۔ ترلوچن اسی کھوئے کھوئے جغرافیہ پر اداس تھا۔

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

"ایوب بھائی ترلوچن کی سالی ہسٹری ہی نہیں جغرافیہ بھی بدل گیا ہے۔ ہم کہاں تھے اور کہاں آگئے ہیں۔ آدمی کی سائکلوجی کے ساتھ مجرم کی سائکلوجی سکھاتے ہیں سالے ہمکو (MODERNITY) کی نئی آتما کی پہچان کرائی جاتی ہے۔ اس کے ہیزرڈ (HAZARDS) گنوائے جاتے ہیں۔ اس لئے ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ۔ ترلوچن موٹی سی گالی دے کر بھول جاتا ہے کہ وہ کیا کہہ رہا تھا۔ ایوب میاں سب کچھ سنتے ہیں، وہ جان گئے ہیں کہ ترلوچن کا جغرافیہ کچھ بھی ہے کسی کو خوف زدہ کرنے کے لئے ترلوچن اور اس کے تھانے کے پاس وسائل بہت ہیں۔

ایوب میاں اداس تو رہنے ہی لگے تھے۔ اس کیفیت میں جب دوکان کے منیجر نے صرف پندرہ دنوں میں مفت خوروں کے لئے دوکان کے پیک (PACK) ہونے والے سامان کی قیمت کا شمار پیش کیا تو ان کی کوفت اور بڑھ گئی۔ اس فہرست میں انکم ٹیکس اور سیلس ٹیکس کے محکموں سے متعلق افسران کے علاوہ پولیس والوں کے نام سب سے اوپر تھے اور حلقے کا تھانیداران میں سب سے آگے تھا۔

ایوب میاں کے دھندے میں وبائی اموات کو چھوڑ دیا جائے تو بھی فارم کی زبان میں ایک کلو کے پلے پلائے چار پانچ مُرغوں کی مارٹیلٹی (MORTALITY) آئے دن ہوجایا کرتی تھی۔ ترلوچن سنگھ کی مدارات پر ہونے والے بار بار کے نقصان کی کیفیت ترلوچن سے بیان کرنے کا خیال ہی ایوب میاں کے لیے ایک مصیبت بنا ہوا تھا۔ وہ بار بار فقرے اپنے ذہن میں تیار کرتے ہگر سب انہیں اوچھے لگتے۔ کیونکہ دوکانداری کے بھی اپنے کچھ تقاضے تھے اس لئے ایوب میاں نے بڑی عاجزی سے ایک بار ترلوچن سنگھ سے اپنے کاروبار کے جوکھم اور بینک سے لئے گئے قرضوں کے بوجھ کا ذکر کیا تو اس کا اتنا اثر ضرور ہوا کہ دوستوں کو کھانے میں شریک کرتے وقت قیمت کی کچھ معمولی رقم ترلوچن کبھی کبھی بھیج دیا کرتا۔ ایک بار ترلوچن کا سامان لے جانے والے سپاہی کے ساتھ دوکان کے منیجر نے کچھ ایسی بے رخی برتی کہ ترلوچن ایوب میاں سے کچھ بدمزہ ہوگیا۔ اس نے اس دن ایوب میاں کو آگاہ کیا کہ وہ ترلوچن کے ساتھ کبھی کبھی جو سلوک کرتے ہیں اسکو وہ احسان نہ سمجھیں۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ ایوب میاں سے وہ فائدہ ہی نہیں اٹھا رہا ہے جو اسے اٹھانا چاہئے۔ اس

Scanned by CamScanner

وقت یہ انکشاف بھی اس نے کیا کہ تھانہ اسے مفت میں نہیں مل گیا ہے بلکہ ایک لاکھ کی بولی چھڑا کر ہی اس نے ترقی حاصل کی ہے اور ایک لاکھ کی رقم جمع کرنے کے لئے اس کی پڑھی لکھی بیوی نے اپنے سارے زیور ترلوچن سنگھ کے سامنے ڈال دیئے تھے۔ ترلوچن کے لئے ایوب میاں ایک معمولی سے آدمی تھے اس لئے ترلوچن نے ان سے یہ اقرار کرنے میں بھی کوئی دشواری نہ سمجھی کہ آدھی تھانیداری انھیں ان کی بیوی نے سکھائی ہے۔ زیور سامنے رکھ کر اس نے اپنا فیصلہ سنایا تھا!

''دیکھو جی یہ بال بچوں کی اگلی زندگی کا سوال ہے۔'' جیسے بھی ہو اس تھانے کو حاصل کرو۔ وقت انتظار کا نام نہیں ہے بلکہ TIME IS MONEY '' اسکے پیچھے یہ حساب کتاب بھی تھا کہ جو تھانہ ترلوچن ایک لاکھ میں خریدے گا، وہ اسے ڈیڑھ لاکھ میں پڑے گا، کیونکہ بڑے حکام کے تبادلوں پر چھوٹے حکام آتے ہی اپنا کھاتا کھول دیں گے۔ خود ترلوچن کا تبادلہ بھی کبھی ہو سکتا ہے، اس لئے ڈیڑھ کے تین لاکھ بنانے کے واسطے جو مہلت ہے اس کا بھی کوئی بھروسہ نہیں، ایک دن ایوب میاں کی دوکان کے منیجر نے انہیں سمجھایا کہ ایسے لوگ جنھیں مفت مال درکار ہو اپنا آڈر پیشگی دے دیا کریں۔ ورنہ سب سے بڑی دشواری یہ ہوتی ہے کہ مال ختم ہو جانے پر نقد خریدنے والے گاہک کو بھی مایوس لوٹنا پڑتا ہے۔ دوکان پر اس تجویز پر سختی سے عمل ہونے لگا۔ چند ماہ بعد ایک بار دوکان کے اسٹاک وغیرہ کا حساب کتاب دیکھتے وقت ایوب میاں کو معلوم ہوا کہ فارم پر سے دوکان کے واسطے جو مرغ آتے ہیں، کبھی کبھی ان کی مقدار تو کم ہوتی ہے لیکن دوکان پر تیار کئے جانے والے سامان میں جو مرغ کھپائے جاتے ہیں ان کی مقدار زیادہ ہوتی ہے، جبکہ پچھلے دن کھپائے جانے والے کچے مال میں کوئی مرغ بچتا ہی نہیں تھا، تو سوال پیدا ہوا کہ زائد مرغ کہاں سے آئے؟ بڑی پوچھ تاچھ کے بعد ایوب میاں کو پتہ لگا کہ مفت خوروں کے پیشگی آرڈر ملنے پر منیجر اس آڈر کی بھرپائی کے لئے فارم پر مر جانے والے مرغوں کو کتے کے آگے ڈالنے کے بجائے دوکان پر منگوا لیا کرتا تھا۔ اور ان مردہ مرغوں کو قیمتی مسالوں کی گریوی (GRAVY) میں پکانے کے بجائے سستے اور ملاوٹی مسالوں میں پکا کر تھانیدار وغیرہ کو سپلائی کر دیا کرتا تھا۔ ایوب میاں نے اپنا سر پکڑ لیا، بڑے باورچی سے جواب طلب کیا تو اس نے بتایا کہ وہ

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

اپنے مالک کا خیرخواہ ہے اور اچھی طرح سے یہ بات جانتا ہے کہ جن لوگوں کے پاس وہ مال جاتا ہے وہ لوگ شراب کے ساتھ ہی نوالہ اٹھاتے ہیں اس لئے وہ نہیں جان پاتے کہ وہ کیا کھا رہے ہیں۔

ایوب میاں نے بہت واویلا مچایا اور رات بھر اپنے بستر پر کروٹیں بدلتے ہوئے یہ سوچ کر انگاروں پر لوٹتے رہے کہ فارم پر کتوں کے آگے ڈالی جانے والی مارٹیلیٹی (MORTALITY) ان کے باورچی خانے تک آگئی ہے۔

انہیں دنوں ایوب میاں کو خبر ملی کہ ترلوچن سنگھ کا تبادلہ کسی دوسرے شہر میں ہوگیا ہے مگر ایوب میاں تو کسی دوسرے ہی صدمے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ وہ زیادہ تر کچن میں ہی گھسے رہتے۔ وہاں آنے جانے والی ایک ایک شئے پر نظر رکھنا، چولھے پر چڑھی ہانڈیوں کے ڈھکن اٹھا کر بار بار جھانکنا اور گاڑیوں میں کھانے والوں کے پاس جا کر یہ معلوم کرنا انھوں نے شروع کر دیا تھا کہ کھانوں کا ذائقہ کیسا تھا۔

ایک دن صبح صبح ایوب میاں کے گھر کی کال بیل بجی۔ ملازم نے جو اطلاع دی وہ خاصی غیر متوقع تھی۔ ایوب میاں دروازے پر گئے تو واقعی ترلوچن مع اپنی بیوی اور تیرہ چودہ برس کے ایک بچے کے کھڑے تھے۔ ایوب میاں نے نہ تو ترلوچن کو ایسے لباس اور حلیہ میں دیکھا تھا اور نہ اس قرینہ میں ایوب میاں کو بڑی حیرت ہوئی۔ جلدی سے مہمانوں کو ڈرائنگ روم میں لائے، بٹھایا۔ انہیں بڑا اچھا لگا یہ دیکھ کر کہ ترلوچن کے ہر انداز میں ایک انکسار تھا۔ اس کی بیوی کو کنکھیوں سے کئی بار انہوں نے دیکھا۔ گوری چٹی تنومند چہرے پر وقار کے ساتھ نرمی بھی۔ ایوب میاں کی والدہ کو دیکھ کر ترلوچن کی بیوی کا احترام کے ساتھ ماں کے پاؤں چھونا ایوب میاں کو بہت بھایا۔ پھر بیوی نے سوغات کے طور پر مٹھائی کا ڈبہ پیش کیا اور ترلوچن نے وضاحت کی کہ وہ صرف ایک دن کے لیے آیا ہے تاکہ اپنے بیٹے کو اسکول کے بورڈنگ میں داخل کرا سکے۔ جب گھر پر ٹھہرنے کی پیش کش ترلوچن نے قبول نہ کی تو ایوب میاں نے رات کا کھانا ساتھ کھانے کی درخواست کی۔ ترلوچن راضی ہوگیا۔ پھر وہ لوگ بچے کو لیکر اسکول چلے گئے اور سہ پہر کو ایوب میاں نے دو اچھے وزن دار گھر میں نازو نعمت سے پالے گئے دیسی مرغے ذبح کرائے، گوشت کا ریشہ ریشہ خود صاف کیا، بہترین

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

مسالوں میں نفاست کے ساتھ اپنی نگرانی میں پکوایا۔ اسپین کی لاجواب زعفران کی مہر بند ڈبیاں جو انہیں کسی نے تحفے میں دی تھی اپنے ہاتھ سے کھولی، آدھی چٹکی دودھ میں گھس کر حل کی اور تیاری سے کچھ پہلے ہانڈی میں ڈالی۔ گھر کے خادموں نے دعوتیں تو گھر میں بہت دیکھی تھیں مگر انھیں میاں کا یہ انہماک کچھ نیا نیا سا لگا جو خوش رنگ سلاد کی پلیٹ کی تیاری میں ہی نظر آنا شروع ہو گیا تھا۔ دستر خوان پر ایوب میاں نے مرغ کے ڈونگے کا ڈھکنا یوں اٹھایا جیسے کوئی بچہ اپنے ہاتھ کی بنائی ہوئی کوئی خوبصورت ڈرائنگ ورق پلٹ کر کسی کو دکھاتا ہے۔ ڈھکنا کھولتے ہی مسالوں اور زعفران کی خوشبو میں بسی گرم بھاپ اوپر اٹھی۔ اصلی گھی کے بادامی تار کے گوشت کے نفاست سے کاٹے گئے ٹکڑے تہ تک خوش ذائقہ مسالوں میں لپٹے ہوئے تھے۔ ترلوچن سنگھ نے ایک بوٹی توڑی تو اس کی خستگی کسی ادھ کھلی کلی کی طرح چٹک پڑی۔ ایوب میاں نے غور سے ترلوچن کو نوالہ توڑتے ہوئے دیکھا اور چہرے پر ذائقے کے تاثر کو بھانپنے کی کوشش کی۔ جب وہ دستر خوان سے اٹھا تو اس کی دونوں کنپٹیوں کے پیچھے پسینے کی لکیر سی بن گئی تھی اور وہ حلق تک بھرا ہوا ہانپ رہا تھا۔ ایوب میاں نے جب خاصدان میں چاندی کے ورق میں لپٹی ہوئی پان کی گلوریاں ترلوچن کی طرف بڑھا کر نگاہ کی تو ترلوچن انھیں بہت اچھا لگا۔ انہیں لگا نہ تو ترلوچن کا کوئی نام ہے اور نہ تھپہ وہ تو ایک باپ ہے اور شوہر بھی جو اپنی بیوی بچے کے ساتھ ان کے دروازے پر مہمان آیا ہے۔ ایوب میاں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ فوری طور پر ترلوچن کے سراپے سے جو چیز غائب تھی وہ غالبًا اس کی وردی تھی۔ رخصت کے وقت دونوں نے گرم جوشی سے شکریہ کا اظہار کیا اور ترلوچن آئندہ بھی ملتے رہنے کا وعدہ کر کے رخصت ہوا۔

ایوب میاں ترلوچن کی دعوت کے لطف کو ابھی بھول بھی نہ پائے تھے کہ ان کے پولٹری فارم پر تعینات ڈاکٹر نے انہیں فون پر ایک بری خبر دی۔ ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ پانچ ہزار چوزوں کی نئی کھیپ جنہیں اب تک کھا پی کر سو گرام کا ہو جانا چاہیئے تھا، مشکل سے ساٹھ گرام وزن ہی پکڑ پائے ہیں۔ اور یہ بات بھی باعثِ تشویش ہے کہ وہ عام چوزوں کی طرح چل پھر بھی نہیں پا رہے ہیں۔ اس لئے ڈاکٹر کو شک ہے کہ اگلے پندرہ بیس دن میں فالج کے اثر سے ان کی ٹانگیں رہ جائیں گی کیونکہ دوائیں بے اثر ہو رہی تھیں اس لئے ڈاکٹر کو اس بات کا

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

پختہ شک تھا کہ جس دانہ مل سے دانہ سپلائی کیا جارہا تھا وہ دانہ قائم شدہ معیار کے مطابق نہیں تیار کیا گیا تھا۔ ایوب میاں کو یقین نہیں آرہا تھا کہ جس مار ٹے لیٹی (MORTALITY) کو انہوں نے اپنے بچن میں دیکھ کر سر پیٹ لیا تھا وہ کب کی ہر جانب اپنا گھر بنا چکی تھی۔ ایوب میاں نے حالانکہ گھر پر اس مصیبت کا کسی سے ذکر نہ کیا تھا کہ جن چوزوں کی لاگت اب تک پندرہ سولہ روپے فی چوزہ ہو چکی تھی، ان کے مردے وہ پچھلے پندرہ دنوں سے اٹھا رہے ہیں۔ مگر کسی طرح ان کے بوڑھے باپ تک یہ خبر پہنچ چکی تھی کہ بیٹا مصیبت میں ہے۔ ایک دن ایوب میاں فارم کے مردوں کی آخری قسط دفنا کے لوٹے تو گھر میں کہرام سا مچا ہوا تھا۔ ان کا بوڑھا باپ کتب خانے میں غش کھا کر گر پڑا تھا۔ بیوی جس کے کان ہمیشہ کتب خانہ کی جانب ہی لگے رہا کرتے تھے، غیر معمولی آواز پر بغیر دوپٹے اور بغیر چپلوں کے ہی بھاگ کر پہنچی۔ چھوٹے بیٹے کی مدد سے شوہر کو کسی طرح فرش پر کتابوں کے بیچ سے اٹھایا دوسروں کی مدد لیکر بستر پر لٹایا۔ کان کے پاس چوٹ کی خراش کو صاف کیا۔ ایوب کے باپ پر ایک عجیب سی بے چینی طاری تھی، وہ بار بار بیٹے کو یاد کر رہا تھا، ہر آہٹ پر دروازے کو دیکھتا۔ آنکھوں میں نیند رینگتی تو چونک اٹھتا، پھر بیوی سے نگاہوں کی خاموش زبان میں کہتا۔

''ایوب سے کہنا ہم کب تک انتظار کرتے۔'' بیوی خاموشی کے لفظوں میں ادا ہوئے اس فقرے کی بے زبان ادائیگی کو سن کر اور منہ پھیر کر دوپٹے میں رو پڑتی۔

ایوب میاں پہنچے تو باپ کی آنکھیں ایک پل کو چمک اٹھیں بیٹا باپ کے پہلو میں پٹی کے سہارے بیٹھ گیا۔ باپ کے سوکھے ہاتھ کو دونوں ہتھیلیوں میں بند کیا۔ کچھ توقف کے بعد باپ نے دھیرے سے ہتھیلی سے ہاتھ نکالا بیٹے کو گلے لگایا سرہانے سے ایک کتاب اٹھائی درمیان میں رکھے ایک رقعے کو تھما کر اسے پڑھ کر سنانے کا حکم دیتا ہے۔ بیٹا کمزور ہاتھوں کی کاوش سے لکھی گئی عبارت جسکے حرف جگہ جگہ بے قابو ہو گئے تھے بلند آواز میں پڑھتا ہے۔

''جانِ پدر! بے صورتی کی اس کارگاہِ صورت میں ہر باپ اپنے حصے میں آنے والے مخافات کے جہاد پر مامور ہے اور ہر بیٹا اپنی اپنی امیدوں کی بقا کے جہاد پر مامور۔ اس لئے باپ کی فنا میں بقا اور بیٹے کی بقا میں فنا مضمر ہے۔ مگر اے میرے نورالعین فنائیں بقاؤں کی ضامن گیرتب ہوتی ہیں جب زمانے کا حق سے وہی سلوک ہو جو تغیر کا دانش سے ہے

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

یعنی زمانہ حق کی اور تغیر دانش کی خدمت پر مامور ہے۔ باپ تحریر سن کر ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کر لیتا ہے۔

ترلوچن کا لفافہ الٹتے پلٹتے ایوب میاں کو خیال آیا کہ ترلوچن کی دعوت کے بعد بس ایک بار اسکا ایک فون ایوب میاں کی دوکان پر ضرور آیا تھا کہ بورڈنگ میں لڑکے کا داخلہ ہو گیا ہے اور ترلوچن نے ان کی اجازت کے بغیر لڑکے کو مقامی سرپرست کی حیثیت سے ایوب میاں کا نام اور پتا لکھوا دیا ہے۔ اور ان کا بڑا احسان ہوگا کہ وہ کبھی کبھی لڑکے کے بورڈنگ میں رابطہ قائم کر لیا کریں۔ ایوب میاں تو ایک بار ہو بھی آئے تھے، مگر دوبارہ بورڈنگ میں انہیں معلوم ہوا کہ لڑکا شدید بیمار ہوا تھا تو وارڈن نے پولیس لائن خبر پہنچائی جہاں محکمے کے ذریعہ اسے قدرے سنبھلنے کے بعد باپ کے پاس پہنچا دیا گیا۔ اس واقعے کے بعد ایک دن بس اچانک ڈاک سے ترلوچن کا لفافہ ٹپک پڑا تھا، وہ بھی ایک لمبے عرصے بعد۔ ایوب میاں نے دھیرے سے اس غیر متوقع لفافے کو چاک کیا۔ کسی رجسٹر کے پھاڑے گئے کاغذ پر چھوٹی سی عبارت تحریر تھی۔ مضمون میں یہ شرمندگی ظاہر کی گئی تھی کہ وہ ایوب میاں کو اپنا حال احوال نہ لکھ سکا اور یہ بھی کہ انھیں بیٹے کی بیماری اور بورڈنگ سے چلے آنے اور بعد کی کیفیت کی آگاہی بھی نہ دے سکا۔ آگے ایسی کوئی خاص بات تحریر نہ تھی۔ ہاں ایوب کے گھر پر کھائے گئے مرغ کے ذائقے کو بار بار یاد کیا گیا تھا اور یہ درخواست کی گئی تھی کہ ایک بار پھر مرغ کھانے وہ ضرور آئیگا کیونکہ اس کا مزہ ابھی تک اسکی زبان بھولی نہیں ہے۔ ایوب میاں نے دو ایک بار خط کو پڑھا، دھیرے سے میز کی دراز کھولی، پوسٹ کارڈ نکالا۔ وہ جواب لکھنا چاہتے تھے مگر رک گئے، دیر تک سوچتے رہے پھر پوسٹ کارڈ واپس رکھ دیا۔ دراصل ان کی سمجھ میں یہ نہیں آرہا تھا کہ وہ ترلوچن کو کس طرح لکھیں کہ اگر دل میں خوف نہ ہو تو ذائقے حق پر قائم ہو جاتے ہیں انھوں نے جواب لکھنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ وہ میز پر سے اٹھنے کو ہی تھے کہ یکا یک فون کی گھنٹی بجی۔ انھوں نے ریسیور اٹھا کر ہیلو کہا۔ پھر دوسری طرف کسی سوال پر ہاں کہہ کر آگے کی بات سنتے رہے۔ بات ختم ہوئی تو بجھی آواز میں ''ٹھیک ہے'' کہہ کر ریسیور تو رکھ دیا مگر فون کرنے والے کا ایک ناگوار سا سراپا ان کی آنکھوں کے سامنے موجود رہا۔ ان کے چہرے کا رنگ کچھ پھیکا پڑ گیا تھا۔ انھیں لگا کہ دل پر بوجھ سا ہو گیا ہے۔ خون میں اداسی سی

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

سرسرائی تو چاہنے والا مرحوم باپ یاد آیا جس نے مرنے سے ایک دن پہلے ماں کی زبانی ہدایت کی تھی کہ جو کتابیں وہ الماریوں میں رکھ رہے ہیں انھیں ایسے لوگوں کے سپرد کر دیا جائے جو رواتیوں کو تغیر کے زخموں کے لئے محفوظ کر لیتے ہیں۔

یکا یک ایوب میاں نے ٹھنڈی سانس لے کر خود کو سنبھالا، کیونکہ انھیں جانا تھا۔ وہ باہر نکلنے کے لئے بوجھل دل سے کپڑے تبدیل کر رہے تھے کہ انھیں خیال آیا کہ وہاں جا کر جو کچھ بھی ہونا ہے اس کا تو انھیں پہلے سے حال معلوم ہے۔ فون کرنے والا اپنے ہتھیار کو ویسے ہی برتے گا جو اسکے اسلحہ کے برتنے کا لازمی قرینہ ہے۔ یہ سوچ کر وہ پھر کرسی پر بیٹھ گئے اور کچھ دیر آنکھیں بند کر کے خود اپنے قرینے کو یاد کر کے دل ہی دل میں ٹٹولتے رہے انھوں نے محسوس کیا کہ وہ باپ کی طرح ابھی اتنے بوڑھے تو نہیں ہوئے ہیں۔ آنکھیں کھولیں تو وہ اداس تو نہ تھے مگر آنکھیں کچھ ایسی دھندلا سی گئی تھیں جیسے کسی بے صورت سی نارسائی کی پرچھائیں ڈھیلوں پر باریک سی کائی کی طرح جم گئی ہو۔ انہوں نے سینے میں لمبی سی سانس بھری اور گھر کے کپڑے پہننے لگے باہر نکلنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ پھر وہ یہ بھی بھول گئے کہ کچھ ہی دیر پہلے فون پر ایک بیہودہ سی دھمکی آمیز ترش آواز میں ترلوچن کی جگہ پر تعینات کسی نووارد تھانہ انچارج نے انہیں تھانے پر طلب کیا تھا۔

(۱۹۹۹ء)

□□□

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

سایۂ شجر

میں نے جنوبی ہند کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں آنکھ کھولی۔ اپنے گھر میں بچپن سے غربت دیکھی، فاقہ ہمارے گھر اکثر مہمان ہوتا، گھر کی چھت ہر برسات میں روتی، ہماری لالٹین میں اکثر تیل بھی نہ ہوتا۔ اب میں ایسے شہر میں ہوں جہاں بڑے بڑے دفتر ہیں، سب سے بڑی عدالت ہے، سب سے بڑا حاکم ہے، سینکڑوں کمپنیاں ہیں یہاں ملک بھر سے لاکھوں حاجت مند حاجت روائی کے لیے آتے ہیں دن بھر سڑکوں پر بسوں یا ٹیکسیوں میں یا پیدل ہی اپنے اپنے مسائل کے چکر میں مارے مارے پھرتے ہیں میں نے یہاں آکر سستے داموں انکا پیٹ بھرنے کے لیے ٹھیلے پر ڈوسہ بیچنا شروع کیا (اگر آپ نہیں جانتے تو بتادوں کہ ڈوسہ چاول اور ماش کی دال کے گھول میں ہلکا سا خمیر اٹھا کر بڑے سے چپٹے توے پر پراٹھے کی طرح باریک پرت میں ہلکی سی چکنائی میں سینکا جاتا ہے اور پھر اس کے اندر آلو پیاز کا مسالہ بھرا جاتا ہے۔ ڈوسے کو ایک خاص طرح کے کھٹے اور چٹپٹے شوربے جسے سانبر کہتے ہیں کے ساتھ کھایا جاتا ہے اس کے ساتھ ناریل کی چٹنی بھی ہوتی ہے)۔ جب میں نے ٹھیلا لگایا تو چاول اور ماش کی دال کا گھول تیار کرنے کے لیے اسے پہلے خود اپنے ہی ہاتھوں سے بھاری پتھر کے بٹے سے پیسنا! یہ کام خاصی مشقت کا ہوتا ہے، سال بھر تک میں اکیلا ہی یہ کام اپنے ہی ہاتھوں سے کرتا رہا، میری ہتھیلیوں میں گھٹے پڑ گئے۔ سڑک پر ٹھیلا لیکر آتا تو ٹرافک کانسٹیبل مجھے ستاتے۔ چار پانچ ڈوسے تو مجھے حرام خوروں کے نام کے روز نکالنے پڑتے۔ دھوپ، گرمی، آندھی سب کچھ میرے اوپر سے گزر جاتے۔ آج میں اس پیڑ پر جل چڑھاتا ہوں جسکے سائے نے مجھے اور میرے ٹھیلے کو ان موسموں میں آسرا دیا۔

آج شہر میں میرے اپنے آٹھ ریسٹورینٹ ہیں، پہلی دوکان میں نے ٹھیلا لگانے کے پانچ برس بعد کرائے پر لی تھی۔ اس دوکان میں چھوٹا سا ریسٹورینٹ کھولا تھا تب میں نے ڈوسے کے ساتھ اڈلی بھی بیچنا شروع کردیا تھا، میرے ڈوسے کی خستگی اور ذائقہ اتنا

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

مشہور ہوا کہ بڑے آدمیوں کی کاروں کی لائن لگنے لگی۔ آج شہر کے مختلف علاقوں میں میرے آٹھوں ریسٹورینٹ میں صرف دو کروڑ کا گرینائٹ پتھر ہی لگا ہوگا، بلجیم کے جھاڑ فانوس دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں تقریباً سولوگوں کو میں تنخواہیں تقسیم کرتا ہوں۔ ان میں سے زیادہ تر لوگ میرے وطن کے ہیں جو اپنی مفلسی سے لڑنے کے لیے میرے پاس چلے آئے ہیں میری رہائش گاہ کے عقب میں ایک عمارت صرف میرے وطن سے آنے والے پریشان حالوں کے قیام وطعام کے لیے ہی بنی ہے جو اپنی قسمت آزمانے گھر بار چھوڑ کر نکل آتے ہیں۔ میں نے اپنے عملے کے ان ملازمین کی تعداد آپ کو نہیں بتائی جن میں اکاؤنٹنٹ ہیں، وکیل ہیں، سپروائزر اور منیجر ہیں، الکٹرک ٹیکنیشین ہیں، سکیورٹی اسٹاف ہے اور ایسے بہت سے لوگ ہیں جن کے بارے میں خود مجھے بھی ان کی ذمہ داریوں اور کاموں کا پتہ نہیں، یعنی صرف میری رہائش گاہ پر لگے تمام ملازمین کو منظم رکھنے اور ان سے متعلق مسائل کو براہ راست دیکھنے کے لیے ہی لمبی تنخواہیں پانے والے کئی ملازم ہیں۔ میری آمدنی پانچ سال پہلے چوالیس لاکھ روپیہ ماہانہ تھی۔ پچھلے سال یہ آمدنی ۶۱ لاکھ روپیہ ہوگئی تھی۔ اور اس سال کا لیکھا جوکھا ابھی تیار نہیں ہوا ہے۔ جب میں پیڑ کے نیچے ٹھیلا لگاتا تھا تو وہاں ہمیشہ بھوکا رہنے والا بدشکل سا ایک دیسی کتا بھی بیٹھا رہتا تھا، پہلا ریسٹورینٹ کھولنے پر میں اس کتے کو اپنے ساتھ لے آیا تھا، جب میں چوتھی دوکان کھول رہا تھا تو وہ بیمار پڑ گیا، کتے کو ڈاکٹر گھر پر دیکھنے آتا تھا مگر وہ پاگل ہوکر مر گیا۔ پیڑ کے نیچے کی تھوڑی تھوڑی خاک خوبصورت شیشے کے کیس میں میں نے اپنے ہر ریسٹورینٹ میں رکھی ہوئی ہے جب میں اس پیڑ پر جل چڑھاتا ہوں اس سے یہ ضرور کہتا ہوں کہ جو سیوا اس نے میری کی ہے اس کا بدلا ایک لٹیا پانی کبھی نہیں ہوسکتا۔ تو وہ پیڑ مجھے جواب دیتا ہے کہ زمین نے اس سے یہ وعدہ لیا تھا کہ وہ پیڑ سکھ کی تلاش میں یہاں وہاں مارا مارا نہیں پھریگا بلکہ ایک جگہ پر ہی دن رات ہر موسم اور ہر حال میں ایک ہی جگہ قائم رہے گا۔ اور وہ کبھی اس بات کے لیے بھی پریشان نہ ہوگا کہ جو کچھ وہ کرتا آرہا ہے اس سے زیادہ کیوں نہیں کرتا۔

ہوٹل یا ریسٹورینٹ چلانے والے جانتے ہیں کہ اس کاروبار میں لیبر کی جانب سے کس قدر پریشانیاں اٹھانی پڑتی ہیں۔ میرے ملازمین کبھی آپس میں تو کبھی دوسروں سے

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

جھگڑ جاتے ہیں، سر بھی پھوٹتے ہیں، فوجداری کے مقدمے کھڑے ہو جاتے ہیں، دولڑکے ابھی پچھلے سال ایک فلیٹ میں گھس گئے تھے، ایک بزرگ خاتون کو جان سے مار دیا اور نقد و زیورات لیکر بھاگ گئے، پولیس نے تفتیش وغیرہ کے بعد گرفتار کرلیا، ان سب معاملات کی قانونی چارہ جوئی کے لیے ہم نے وکیل ماہانہ تنخواہوں پر رکھ چھوڑے ہیں، جو ان کی ضمانتیں کرواتے ہیں اور قانونی پیروی وغیرہ کرتے ہیں تاکہ ایسے ملازمین جنھوں نے سنگین جرم نہ کیے ہوں کام چھوڑ کر نہ بھاگیں۔ ان ملازمین کی بیماری آزاری کی صورت میں دوا علاج کی ذمہ داری بھی میں نے اپنے سر لی ہوئی ہے۔ چند ڈاکٹر اسی کام کے لیے ہیں۔ یہی نہیں ان کے یہاں ولادت کے موقعے پر ایک ماہ کی تنخواہ پیشگی بھی دے دی جاتی ہے۔

ہمارے اس کاروبار میں موسم کی گرمیاں اور سردیاں ہمارے سامنے ہوتی ہیں۔ اپنی رہائش اور کاروباری ٹھکانوں کو گرمیوں میں سرد اور سردیوں میں گرم رکھنے کے لیے ہم نے تقریباً پچاس اے۔سی۔ مشینیں لگا رکھی ہیں ان میں سے پندرہ تو صرف ہماری رہائش گاہ پر کام کر رہی ہیں، آئے دن بجلی فیل ہو جانے اور پھر دیر دیر تک سپلائی نہ ملنے پر ایئر کنڈیشن ٹھکانے دوزخ بن جایا کرتے ہیں، اس کی شکایت ہم نے بجلی کے سب سے بڑے انجینئر سے کی، لیکن اس نے مجبوری ظاہر کی تو میں نے اس سے سخت الفاظ میں سوال کیا۔

"تو پھر یہ محکمہ کس لیے قائم کیا گیا ہے۔ اور آپ لوگ اتنی موٹی موٹی تنخواہوں کے ساتھ یہاں کیا کر رہے ہیں۔"؟

تو اس نے مجھے سمجھایا کہ محکمہ مجھے ہی صرف بجلی پہنچانے کے لیے قائم نہیں کیا گیا ہے بلکہ شہر کی ۸۰ لاکھ آبادی کو بجلی فراہم کرنے کے لیے قائم ہے اور وہ لوگ وہاں موٹی موٹی تنخواہوں پر اس لیے بٹھائے گئے ہیں کہ ۵۵ لاکھ لوگوں کو بجلی دینے کی صلاحیت رکھنے والے پاور اسٹیشنوں کے ذریعہ شہر کے ۸۰ لاکھ ضرورت مندوں کو زیادہ سے زیادہ چھ بلب اور دو پنکھوں کو چلانے کے لیے بجلی کی تقسیم کس طرح کی جائے۔" جب اس سے زیادہ بحث کی تو اس نے مجھے مشورہ دیا کہ حکومت اس معاملے میں بے بس ہے اس لیے اپنے تصرف میں لائی جانے والی بجلی کا میں اپنے طور پر خود ہی انتظام کروں۔ اس لیے اب میرے پاس دس بڑے بڑے جنریٹر ہیں جو سپلائی بند ہو جانے پر شور مچاتے ہیں اور بجلی پیدا کرتے ہیں، ان

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

جنریٹروں کو چلانے کے لیے ہمیں ڈیزل برابر ملتا رہے اس کے لیے مجھے جو جتن کرنے پڑتے ہیں اس سے کسی کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔

جو لڑائی ہمیں روشنی حاصل کرنے کے لیے لڑنا پڑی ویسی تگ و دو ہمیں پانی حاصل کرنے کے لیے بھی کرنا پڑی، لاکھوں روپے صرف کر کے ہم اب تک زمین میں ۶۱ بور کروا چکے ہیں جن میں ۴۱ بور یا تو ناکام رہے یا ان سے تشفی بخش پانی نہیں مل سکا لیکن جب آئے دن اخباروں میں پانی میں گندگی پائے جانے اور ان سے بیماریاں پھیلنے کی خبریں عام ہونے لگیں تو شہر میں ایسے کھانے کے ہوٹلوں کی توقیر بڑھی جو اپنے گاہکوں کو اکواگارڈ کی مشینوں سے چھنا ہوا پانی پلانے لگے تھے، اس لیے آج ہمارے دھندے میں بارہ مشینیں اکوا واٹر فراہم کرنے کا کام کر رہی ہیں۔ جن کے چلتے رہنے کی ذمہ داری خود مجھے ہی سنبھالنی پڑ رہی ہے۔

دوا علاج کے سلسلے میں بھی حکومت نے میری اور میرے گھر والوں کے علاج کی ذمہ داری لینے سے ہاتھ اوپر اٹھا دیئے۔ میں اپنی بیوی کو شہرت یافتہ ایک قومی میڈیکل انسٹیٹیوٹ میں داخل کرنا چاہتا تھا لیکن وارڈ خالی نہ ہونے کے سبب مجھے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ (یہ ملک کا بڑا میڈیکل کالیج تھا جس میں سینکڑوں وارڈ تھے اور بین الاقوامی شہرت کے ڈاکٹر بہترین ساز و سامان کے ساتھ اپنی خدمات انجام دے رہے تھے)۔ پتہ لگا وہاں کے وارڈ کابینہ وزیروں، ان کے بھائی، بھتیجوں، نوکروں، شاہی افسروں اور ان کے رشتہ داروں، داشتاؤں اور محبوباؤں کے خاندان والوں سے ہی بھرے رہتے ہیں۔ اس لئے شہر کے باحیثیت دس تاجروں نے آپس میں مل کر جن میں سے ایک میں بھی ہوں ایک سنڈیکیٹ قائم کیا ہے جس کے ذریعہ ایک ایسا نرسنگ ہوم تیار کر لیا گیا ہے جہاں ہمارا اور ہمارے کنبے کا معقول علاج ہو سکے۔ (اس کے بعد بھی ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ہمارے طبقے میں مرنے والوں کی تعداد غریب طبقے میں ہونے والی موتوں سے کچھ ہی کم ہے)۔ ایک دن صبح صبح میرا ٹیلیفون بجا۔

''ہیلو'' پچھلے ایک سال سے آپ ہمارا پروجیکٹ ہیں۔'' دوسری طرف سے آواز آئی۔

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

"آپ کا پروجیکٹ؟" میں نے سٹپٹا کر پوچھا۔ "کون صاحب بول رہے ہیں۔"

"ہم اس پروجیکٹ پر اب تک ڈھائی لاکھ روپیہ خرچ کر چکے ہیں۔"
بات کرنے والے نے اپنی شناخت فراہم کیے بغیر بات جاری رکھی۔

"کیسا پروجیکٹ؟" میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے سوال کیا۔ تو جواب ملا۔

"اب ہم آپ کے بارے میں آپ سے زیادہ جانتے ہیں۔"

"کیا جانتے ہیں۔؟"۔ "آپ بول کون رہے ہیں"؟

"ہم آپ کی املاک، آپ کے بینک کھاتے آپ کی آمدنی اور آپ کے اخراجات یہاں تک کہ ہر چیز کے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے جانتے ہوں گے مگر مطلب کیا ہے آپ کا؟"

"ہم کو آپ سے ایک کروڑ روپیہ درکار ہے۔ انکار کی صورت میں آپ کے آٹھ برس کے لڑکے کو ہم اٹھا لے جائینگے اور تب بھی آپ نے رقم نہ دی تو ہم اسے قتل کر دینگے۔"

ٹیلیفون رکھ دیا گیا۔ مجھے لگا جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ پھر ہر دوسرے تیسرے دن یہ فون آنے لگے۔

پولیس کے حکام سے جب میں نے ملاقات کی تو بات یہاں پر آ کر ٹھہری کہ جس طرح میں نے اپنی بجلی کا انتظام کیا ہے، اور جس طرح اپنے پانی کا سارا بندوبست کیا ہے اور جس طرح اپنے دوا علاج کے لیے خود نرسنگ ہوم کھول لیا ہے ٹھیک اسی طرح میں اپنی اور اپنے کنبے کی حفاظت کا انتظام کروں کیونکہ پولیس اس معاملے میں اس لیے بھی بے بس ہے کہ اس سے وزیروں، لیڈروں اور دیگر اعلیٰ حکام کی حفاظت کا بوجھ ہی نہیں سنبھل پا رہا ہے اور آئے دن ہائی سکیورٹی کے زمرے میں آنے والوں کی فہرست لمبی ہوتی جا رہی ہے۔ لہٰذا دوسرے تاجر جس طرح اپنی حفاظت کر رہے ہیں آپ بھی کریئے۔ اسلیئے آج میرے اور

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

میرے گھر والوں کے ارد گرد نی کس دس ہزار روپے ماہانہ کے اعلیٰ تربیت یافتہ مضبوط پھر تیلے اور کیل کانٹے سے درست چار پرائیویٹ سکیورٹی گارڈ ہیں جن کے ضروری ساز و سامان کے کرائے کی ادائیگی کے ساتھ تقریباً پچاس ہزار روپیہ ماہانہ اپنی حفاظتی تدابیر پر مجھے خرچ کرنا پڑ رہا ہے۔ لیکن اسکے باوجود ہر پندرہ دن بعد ٹیلیفون والی آواز مجھے یاد دلاتی رہتی ہے کہ میرا بیٹا ان تمام تدابیر کے بعد بھی اٹھالیا جائیگا اور تب ہی واپس کیا جائیگا جب میں ایک کروڑ روپیہ ادا کر دونگا۔

ایک دن میں اپنے اس قدیم پیڑ پر جل چڑھانے گیا تو میں نے اس سے کہا کہ میں بہت تھک گیا ہوں، چپکے چپکے روتا ہوں، معمولی آہٹ پر چونک پڑتا ہوں، تمام چھوٹی چھوٹی خوشیاں مجھ سے روٹھ چکی ہیں اور کوئی بڑی خوشی آج بھی بس ایک خواب ہے، میں چاہتا ہوں کہ سب کچھ بیچ کر تمھارے سائے کے نیچے بس ایک ٹھیلا لگاؤں اپنا وہی پرانا ٹھیلا جسے میں نے آج بھی سنبھال کر رکھا ہے۔ پیڑ نے میری بات سن کر بڑی رکھائی سے جواب دیا

''اب یہ ممکن نہیں۔''

''کیوں۔؟''

''تمھاری جگہ پر ایک ٹھیلے والا چھولے بھٹورے بیچ رہا ہے۔''

مجھے پیڑ کا روکھا سا جواب اچھا نہیں لگا۔ میں نے باتوں باتوں میں پیڑ پر یہ ظاہر کر دیا کہ سایہ دیکر اس نے مجھ پر کوئی احسان نہیں کیا ہے بلکہ سایہ دینا تو اس کی مجبوری تھی کیونکہ اپنے سائے کو وہ کسی لاکر میں تو رکھ نہیں سکتا۔ تو اس نے مجبوری، کے لفظ کو یہ کہہ کر بدل دیا۔

''یہ مجبوری کی بات نہیں ہے، سچ پوچھو تو میں پیڑ اسلئیے ہوں کہ سایہ دینے کے علاوہ میرے پاس کوئی دوسرا ذریعہ نہیں، جس چیز کے پاس جتنے زیادہ ذرائع ہوتے ہیں وہ چیز پیڑ سے اتنی ہی زیادہ مختلف ہوتی ہے۔''

اس معصوم سے پیڑ کو ایسے مدلل انداز میں باتیں کرتے دیکھ کر مجھے غصہ آگیا اور بولا

''میں تم سے تھوڑا سا سایہ مانگنے آیا تھا، تمھاری فلسفہ طرازی سننے نہیں۔''

مجھے لگا کہ پیڑ ہنسا پھر بولا

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

''جس طرح خود تم نے اپنے لیے بجلی، پانی علاج، اور اپنی حفاظت کا انتظام کرلیا ہے اسی طرح جس سائے کی تم کو ضرورت ہے اس کا انتظام بھی کرلو۔''

یہ سن کر مجھے تکلیف ہوئی، صبر کا گھونٹ پی کر لٹیا کا پانی اس پر ڈالنا چاہا تو اس نے مجھے روک دیا۔

''ٹھہرو۔ مجھے معلوم ہے کہ تم کل ٹیلیفون والے کو ایک کروڑ روپیہ دینے جا رہے ہو۔''

''تم کو کیسے معلوم؟'' میں اچھل پڑا

''کیونکہ جس طرح میں سایہ دینے کے لیے مجبور ہوں، اسی طرح یہ روپیہ دینا تمھاری مجبوری ہے۔ اب میری طرح تم بھی ایک پیڑ ہو چکے ہو اور ایک پیڑ کبھی دوسرے پیڑ پر جل نہیں چڑھاتا۔''

میں نے پانی الگ زمین پر پھینک دیا اور غصے میں پیتل کی وہ خالی لٹیا پیڑ پر کھینچ ماری، اس عمل کا پیڑ پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ دھیرے سے بولا۔

''میں سایہ دیتا ہوں۔ لیکن خود سایہ میں نہیں رہ سکتا۔ تم خود ہی دیکھو میرے اوپر ہمیشہ ہی دھوپ رہتی ہے''۔

پہلی بار میں نے پیڑ کو اپنا درد بیان کرتے ہوئے سنا تو میرا غصہ جاتا رہا میں نے اسے کریدا

''کیا تمھارا جی کبھی نہیں چاہتا کہ تم بھی سائے میں رہو؟''

''چاہتا ہے! مگر یہ سوچ کر چپ ہو جاتا ہوں کہ پھر میرے سائے کی شناخت ختم ہو جائیگی۔''

میں نے گردن جھکائی دو پل سوچتا رہا پھر واپس جانے کے لیے مڑا تھا تو اس نے مجھے آواز دے کر روک لیا، میں پلٹا تو وہ بولا۔

''ٹھیلے پر چھولے بھٹورے بیچنے والا کچھ روز میں ایک دوکان کرائے پر لے رہا ہے، تب یہ جگہ خالی ہو جائیگی چاہو تو ٹھیلا لیکر آجاؤ۔''

میں ٹھنڈی سانس لیکر پیڑ کو گھورتا رہا اور پھر پیڑ میرے جواب کا انتظار کرتا رہا، یہ ذرا سا وقفہ

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

مجھے پسینے میں نہلا گیا، مجھے یوں ہراساں سا دیکھ کر اس نے اپنی غلطی سدھاری اور بولا

''شاید میں غلط بول گیا تم کو اگر سائے میں رہنا ہوتا تو تم خود پیڑ کیوں بنتے''!

پیڑ سے ملاقات کے بعد میری بے کلی اور بڑھ گئی، حالانکہ بظاہر میرے ذرائع بھی بڑھ رہے ہیں، اب بچے بھی بلٹ پروف گاڑی میں باہر نکلنے لگے ہیں اور میرا زیادہ تر وقت اپنی آرام دہ چھت کے نیچے گزر رہا ہے لیکن اسکے باوجود مجھے ہر دم ایسا کیوں محسوس ہوتا ہے جیسے آگ اُگلتی ایک مسلسل دھوپ مجھ پر تنی ہوئی ہے۔ اگر میں اپنی زندگی کی کتاب میں اپنے احساسات کے اس بیان کو کسی طرح قلم بند بھی کرلوں اور جیسا کہ میں کر ہی رہا ہوں اسے کئی زبانوں میں چھپوانے کے لیے تو ان سے کسی کو کیا دلچسپی ہوگی کیونکہ احساس کی اہمیت ہی کیا ہے اور پھر ادراک کی طرح احساس سے کوئی خبر بھی تو نہیں بنتی جس سے آپ کا دکھ دوسرے پر روشن ہو سکے۔

(جب میری بے زاری روز بروز بڑھنے لگی تو میں نے سوچا کہ جو کچھ میں محسوس کر رہا ہوں اس کا ذکر کیوں نہ اپنی بیوی سے کروں کہ وہی تو میرے دکھ درد کی ساتھی اور میری ہمراز بھی ہے، پھر خیال آیا کہ پتہ نہیں وہ مجھے میرے اس احساس سے چھٹکارا دلانے میں میری کوئی مدد کر پائیگی یا نہیں)۔ آخر کو ایک دن میں نے ہمت کر کے بیوی سے اپنے سر پر تنی ہوئی دھوپ کی وہ کیفیت پوری تفصیل سے بیان کر دی جو مجھے بینک کے حسابات دیکھتے وقت، انکم ٹیکس اور سیلس ٹیکس کے ذلت آمیز چھاپوں میں سونپے گئے سوال ناموں کو ہاتھوں میں لیتے وقت، اپنے بچے کو خوف کے ساتھ چھاتی سے لگاتے وقت، بازار سے خود کو ہٹائے جانے کے لئے اپنے ہم پیشہ تاجروں کے زہر میں بجھے خطرناک رقابتی اقدامات کا رات رات بھر جاگ جاگ کر تدارک کرتے وقت، پھر خواب آور گولیاں کھا کر اور بیوی کی جانب پیٹھ کر کے سوتے وقت، فون کی گھنٹی ناوقت بجنے پر فون اٹھاتے وقت، اپنے پالتو کتوں کو غیر فطری طور پر ست اور توقع کے خلاف سوتے ہوئے دیکھتے وقت، انجانی کار کو اپنی کار کے پیچھے زیادہ دیر تک چلتے وقت، کسی اجنبی عورت کو کلب یا گھر پر اپنی بیوی سے غیر معمولی دوستی بڑھاتے وقت، کھانے کی میز پر بھوک نہ ہونے کی شکایت کرتے وقت، یہاں تک کہ غیر ملکی عشرت گاہوں میں کسی خوبصورت ساتھی سے ہم بستری کے وقت بھی شدت

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

سے محسوس ہوتی رہتی تھی۔

(مگر مجھے بڑی حیرت ہوئی جب بیوی نے بھی مجھے یہی صلاح دی کہ اس سلسلے میں، میں اس پیڑ سے مشورہ کیوں نہیں کرتا جس کے نیچے سے میں اُٹھا ہوں اور جس پر میں عقیدت سے جل چڑھاتا ہوں۔ یہ سن کر مجھے بیوی کو بتانا پڑا کہ پیڑ سے پہلے ہی میری بات ہو چکی ہے لیکن پیڑ میری مدد کرنے سے مجبور ہے بلکہ اس کا رویہ اب Hostile ہو چکا ہے۔) تب میری بیوی نے مجھے ایک معقول مشورہ دیا۔ اس نے مجھے یاد دلایا کہ میں نے اپنے ہر ریسٹورینٹ میں عقیدتاً اور احتراماً اس پیڑ کے نیچے کی مٹھی بھر خاک خوبصورت بلوریں برتن میں رکھ چھوڑی ہے۔ کیوں نہ میں اس خاک سے مشورہ کروں کہ پیڑ بھی تو اسی خاک سے پھوٹا ہے۔

ایک دن میں منہ اندھیرے اٹھا، اپنے اس ریسٹورینٹ پر گیا جس کا فاصلہ گھر سے قریب تھا، چوکی دار سے دروازہ کھلوایا اور خاک کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ بغیر کسی تمہید کے میں نے خاک کو بتا دیا کہ میں اپنے سر پر ہمیشہ سخت دھوپ سی تپش محسوس کرتا ہوں۔

"مجھے پتہ ہے" خاک نے دھیرے سے کہا۔ "مجھے تو یہ بھی پتہ ہے کہ تمھاری کمائی ہوئی دولت اور تمھاری کروڑوں کی ملکیت جہاں تمھارے بچوں کے حصے میں آئیگی وہیں تمھاری دھوپ بھی انھیں ورثے میں ملیگی۔"

یہ سن کر میں تڑپ اٹھا اور گھبرا کر بولا

"کیا کوئی تدبیر نہیں کہ میں اپنی جان پر دھوپ کے ذریعہ نڈھال کر دینے والے احساس سے چھٹکارہ پا سکوں"۔

"احساس سے چھٹکارہ؟" وہ برا مانتے ہوئے بولی "لگتا ہے تم احساس کی قیمت سے واقف نہیں۔"

"مگر یہ احساس کچھ گونگا سا ہے اور مجھے ہر دم صرف جلاتا رہتا ہے۔"

میں نے عاجزی کا اظہار کیا تو خاک بولی

"تو جلن کو برداشت کرو کہ احساس سے ہی ادراک کو تحریک ملتی ہے

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

۔کون جانے جنھیں تم ورثے میں یہ احساس دے کر جاؤ گے ان کا
ادراک اُس دھوپ پر کوئی شجر تان دینے کی سعی کر لے جائے۔''
میں اس مٹھی بھر خاک کو گھورتا رہا مگر وہ نہ تو آزردہ تھی اور نہ خوش مجھے بڑے پیار سے سمجھاتی رہی لیکن جب میں نے اس کی باتوں کو تسلیم نہ کیا تو وہ مسکرا کر بولی
''کہیں ایسا تو نہیں کہ تمھیں اپنے احساس کو خبر بنا دینے کی بڑی جلدی ہے؟''
''ہاں' مجھے جلدی ہے، شاید میں اس طرح کچھ ہلکا ہو جاؤ نگا۔''
خاک زور سے ہنسی۔ بیٹے۔' پہلی بار اس نے مجھے ممتا کی مہک کے ساتھ مخاطب کیا
'' لگتا ہے مجھے تم کو تمھاری زبان میں سمجھانا پڑیگا۔خبر پہلے ہاتھ سے لکھی جاتی ہے، پھر کاٹی پیٹی اور گھٹائی بڑھائی جاتی ہے، پھر اس کو کمپوزنگ کے لیے بھیجا جاتا ہے اگر سنسر سے بچ گئی تو کسی سرخی کے ساتھ ہی وہ خبر بنتی ہے'' پھر اسنے مجھے چمکارا اور ڈھارس دیتے ہوئے کہنے لگی۔
''کسی چیز کے بننے اور بن کر ادراک کا حصہ بن جانے میں بڑی دیر لگتی ہے، دور کیوں جاؤ مجھے ہی دیکھ لو، مجھے ہی خبر بننے میں کتنی دیر لگی تھی۔''
میں بڑے بوجھل قدموں سے ریسٹورینٹ کے باہری دروازے سے واپس ہونے کو پلٹا، دروازے تک پہنچنے کو ہی تھا کہ پیچھے سے خاک کی آواز آئی
''جس ارادے سے تم واپس جا رہے ہو اگر تم نے ویسا ہی کیا تو اتنا یاد رکھنا کہ نا تو تم احساس کا کچھ بگاڑ پاؤ گے اور نہ ادراک کا کہ دونوں ہی میری گود کے پالے ہیں۔''
''کیا کرنے جا رہا ہوں میں؟'' میں نے پلٹ کر ذرا بلند آواز میں خاک سے وضاحت چاہی۔
''خودکشی۔'' وہ چپکے سے بولی۔
اس کے جواب پر میری آنکھوں کے سامنے ایک پل کو اندھیرا سا چھا گیا، میں نے دونوں

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

ہاتھوں سے دروازے کو تھام لیا، دل میں بے بسی کی ایسی ٹیس اٹھی کہ میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تو اسنے میرے کان میں کہا

''زیادہ باخبری سے پریشانیاں بڑھ بھی جاتی ہیں، اکثر چھوٹی لڑائیاں لڑ لینے سے بڑی اور بھیانک جنگ ٹل جایا کرتی ہے۔''

اسی رات میں نے پیڑ کو خواب میں دیکھا۔ بس کچھ پل وہ مجھے دیکھتا رہا اور میں اسے، میں چاہتا تھا کہ اب وہ کچھ نہ بولے مگر کمبخت نہیں مانا اپنی بات کہہ ہی گیا۔

''صرف احساس کے ادراک سے دھوپ کا تشدد تسخیر نہ ہوگا ہو سکے تو اس دھوپ کو چباؤ اور کھاؤ جیسے میں کھاتا ہوں۔

(۱۹۹۷ء)

□□□

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

طلائی مُہر

جہاں وہ بیٹھے تھے وہ ایک وسیع کمرہ تھا۔ چند کرسیاں اور ایک کشادہ میز کے علاوہ انکی پشت پر ایک فلم پروجکٹر تھا اور نگاہوں کے سامنے ایک اسکرین۔ جن دو لوگوں کو وہ اپنے ساتھ کمرے میں لیکر آئے تھے وہ OPINION MAFIA کے اہم رُکن تھے۔ غالباً یہ انکی مجبوری بھی تھی کیونکہ وہ خود کو نہ تو اس مافیا کے مقابلے میں منظم پاتے تھے اور نہ اُن opinion makers کے جیسے وسائل ہی پوری طرح ان کی تحویل میں تھے۔ ذرا بھی وقت گنوائے بغیر ڈائرکٹر نے اپنی بات شروع کی۔

''بنیادی سوال یہی ہے کہ آپ کیا دیکھنے جا رہے ہیں۔ جبکہ آپ کا سب دیکھا ہوا ہے۔'' پھر فوراً ڈائرکٹر کے ساتھی نے بات پر لقمہ دیا۔

''جو آپ دیکھتے ہیں اسکا وجود تو ہوتا ہے۔'' لیکن اسی وقت ڈائرکٹر نے ٹوکا

''بس ابھی ان باتوں میں نہیں جانا ہے۔ ہم فی الحال اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ جو ہم دیکھیں گے وہ شائد ایک سفر میں ہماری شمولیت سے زیادہ کچھ نہ ہوگا۔ بس ایک تلاش کے سلسلے کا سفر۔''

''کیسی تلاش؟'' رائے سازوں کے گروہ کے آدمی نے سوال کیا۔ تو ڈائرکٹر نے وضاحت کی۔

''ایک طلائی مُہر کی تلاش یا پھر کوئی بیش بہا سونے کی اشرفی۔'' رائے ساز زور سے ہنسا اور بولا۔

''اچھا تو آپ میکناز گولڈ قسم کی کوئی فلم دکھانے جا رہے ہیں۔'' جواب میں پہلے ڈائرکٹر اپنا گال کھجاتا رہا پھر چونک کر بولا۔

''حقیقت تو یہ ہے کہ ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ وہ کوئی مُہر یا سونے کا سکہ وغیرہ ہے بھی یا نہیں۔'' اسی وقت ڈائرکٹر کے دوسرے ساتھی نے جو غالباً مکالمہ نگار تھا پھر لقمہ دیا۔

Scanned by CamScanner

"اچھا تو یہ ہوگا کہ ہم اس سکّے کی ماہیت اور کیفیت کو خود اسکی جستجو میں کیے گئے سفر میں ہی مُضمر مان لیں۔" اس مقام پر ڈائرکٹر نے اعتراف کیا۔

"ممکن ہے آپ یہ سوال کریں کہ خود ہماری فلم اسے کیا مان رہی ہے۔" غالبًا مزید کچھ کہنے کی گنجائش نہیں رہ گئی تھی اس لئے ڈائرکٹر نے قدرے بلند آواز میں پروجکٹر پر کھڑے آپریٹر کو ہدائت کی۔

"پلیز ری پلے (Please replay) سامنے کے اسکرین پر منظر روشن ہوگیا۔

ایک لق دق ریگستان کا ہیبت ناک سماں۔ دور غبار کی چادر سے نکل کر دو اونٹوں کے ہیولے برآمد ہوتے ہیں۔ اونٹ گردنیں اٹھائے بے نیازی سے چلے آرہے ہیں۔ اونٹوں پر سواروں کو دیکھا جاسکتا ہے۔ سواروں کے معدوم چہرے پھر دھیرے دھیرے واضح ہوتے ہیں۔ ایک اونٹ پر سامان کے ساتھ کوئی مرد ہے اور دوسرے پر ایک خاتون۔ خاتون کم عمر ہے۔ اسکے کپڑوں کی ساخت بتا رہی ہے کہ وہ مہمّات اور سیاحی کی ضرورتوں کے لحاظ سے تیار کئے گئے ہیں، مرد کی آنکھوں میں ذہانت کی چمک ہے اور خاتون جسکی پیشانی سے اعتماد مترشح ہے اس جانب دیکھ رہی ہے جدھر زمین پر جھکے ہوئے آسمان پر طائر جھپٹتے دکھائی دے رہے ہیں اسی جانب کھجور کے شاداب درختوں کی پھنگیاں سیاہ دھبّوں کے مانند اونٹ کی چال پر ہچکولے کھاتی نظر آرہی ہیں۔ مرد اب خاتون کی سواری کے پہلو بہ پہلو چل رہا ہے انگریزی زبان میں خندہ پیشانی سے مخاطب ہوتا ہے۔

"آپ معاشرہ دیکھنے کا دلچسپ کام کرنے جارہی ہیں، میری نیک خواہشات آپکے ساتھ ہیں"

"شکریہ"۔ خاتون جو انگریز نہیں لگتی گردن کو ہلکا سا خم دیکر مسکراتے ہوئے جواب دیتی ہے

"کیا آپ ایک لمحہ رکنا پسند کریں گی؟" وہ سوال کرتا ہے۔ اونٹ روکے جاتے ہیں تو اس ناگہانی قیام پر حیرت سے گردنیں گھما کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگتے ہیں۔ مرد پانی سے لبریز چھاگل خاتون کو پیش کرتا ہے۔ عورت کو پیاس نہیں ہے، مرد چند جُرعے حلق میں ڈالتا ہے پھر استفسار کرتا ہے۔

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

"یہ سفر آپ نے تنہا ہی کرنا پسند کیا ہے۔"

"نہیں ہمارا ایک آدمی اب تک وہاں پہنچ چکا ہوگا۔"

"یہ اچھا ہے۔" مرد نے اطمینان کا اظہار کیا۔ پھر اپنے اصل موضوع پر آتے ہوئے اسکے چہرے پر سنجیدگی دوڑ گئی اور بولا۔

"پتا نہیں مجھے یہ بات آپ سے کرنا چاہئے۔" کم عمر خاتون جسے لڑکی ہی کہا جا سکتا تھا اُسے دلچسپی سے دیکھنے لگی۔

"کیا آپ جرمن ہیں؟"

"ہاں۔آپ نے شائد میرے لہجے سے پہچان لیا۔اب تو آپ منزل پر پہنچنے کو ہیں۔"

"ہمارا ستہ اچھا گزرا۔" لڑکی نے شکر گزاری کا اظہار کیا۔

"جی ہاں۔اب رخصت کے وقت ایک عرض ہے۔"

"فرمایئے۔" لڑکی ہمہ تن گوش تھی۔

"مجھے کبھی کبھی یہ شک ہوتا ہے حالانکہ یہ بڑی بے حیثیت سی بات ہے کہ ہم سب شائد ایک ہی طرح کے دکھ جھیلتے ہیں۔" لڑکی خاموشی سے اسے دیکھتی رہی غالباً ٹہر کر وہ اپنے خیالات کو سلجھانے میں لگا تھا۔

"اب دیکھئے نا" یکا یک اسے جیسے بر امل گیا۔ "یہ کتنی دلچسپ بات ہے کہ جرمنی نے جلتی ہوئی پارلیامنٹ کے شعلوں سے آسمان کو لال ہوتے دیکھا ہے۔ بڑے بڑے دانشوروں کو رات کے اندھیرے میں منہ چھپا کر وطن سے ہجرت کرتے اور اجنبی زمینوں پر ٹھوکریں کھاتے دیکھا ہے۔ اس لئے آپکی اجازت سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ آپ چاہیں تو اس پر غور کر سکتی ہیں۔"

"مجھے خوشی ہوگی۔" لڑکی نے اخلاق کا مظاہرہ کیا۔

"یہ شعلے یونہی تفریحاً اٹھے تھے یا آتش زدہ آسمان میں کشمکش کی کوئی آگ مُضمر تھی۔ بس مجھے یہی تلاش اچھی لگتی ہے جس میں کشمکش کی دید کو مرکزیت حاصل ہو۔"

"یہ آپ کا اپنا انتخاب ہے نا۔" لڑکی زور سے ہنسی

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

''شائد کچھ ایسا ہی ہو۔ مرد نے ہنسی کا ساتھ دیا۔'' مگر ہوا پرستی پر گزر بسر کرنے والے کشمکش کی دید سے بھاگتے ہیں وہ بوجھ اٹھانا نہیں چاہتے مگر کشمکش کی آگ جلتی رہتی ہے ،یہ کہہ کر سوار نے اپنی سواری کا رُخ دوسری طرف موڑ دیا۔ لڑکی دور ہوتے اجنبی مسافر کو گردن گھما کر دو پل دلچسپی سے دیکھتی رہی۔

سامنے ڈوبتے سورج کی لالی میں کھجوروں کے درختوں کے جھنڈ اب لہراتے ہوئے صاف جھوم رہے تھے۔ اور بستی کے در و دیوار واضح ہونے لگے تھے۔ جیسے جیسے لڑکی آبادی کی جانب بڑھتی ہے درختوں کے جھنڈ میں ایک خیمہ اور اسکے برابر کھڑا کوئی آدمی آنے والی کی جانب اپنا ایک ہاتھ ہوا میں لہرا کر استقبال کرتا نظر آتا ہے ،قریب پہنچنے پر اونٹ زمین پر بٹھایا جاتا ہے ،لڑکی مسکراتی ہوئی اترتی ہے اور استقبال کرنے والے سے بغل گیر ہو کر اسکے ساتھ خیمے کے اندر چلی جاتی ہے منظر تبدیل ہوتا ہے۔

نئے منظر میں ایک شیخ کم عمر اونٹنی کے دانے پانی کے انتظام میں معروف ہے، اس کا ایک ساتھی ان کاموں میں اسکا ہاتھ بٹا رہا ہے، شام کا جھٹپٹا اب اندھیروں کے پنجے گاڑنے کو ہے۔ کم عمر اونٹنی کا مالک اپنے حُلئیے سے ایک پختہ عمر زیرک اور جفاکش ریگستانی لگتا ہے جسکے سراپے سے اس کے تمدن کے ایسے ترقی یافتہ وسائل نظر نہیں آرہے ہیں جو کسی تہذیب کو آگے لے جانے میں مددگار ہوتے ہیں۔ کام سے فراغت پا کر وہ دونوں موٹی دیواروں سے گھرے قدیم طرز کے دروازے کی جانب بڑھتے ہیں۔ دہلیز پر قدم رکھنے سے پہلے شیخ اپنے ساتھی سے جو جوانی کی سرحدوں میں داخل ہو چکا ہے اور جسکا بدن شیخ سے زیادہ گٹھا ہوا ہے چہرے پر نگاہ ڈالے بغیر مخاطب ہوتا ہے

''تمکو نہیں معلوم کہ اس جانور کا جدّ امجد کون تھا اور کہاں سے آیا تھا'' نوجوان جواب میں شیخ کی شکل دیکھنے لگا۔ دونوں گھر کے اندر چلے گئے۔ نوجوان نے اندھیرے میں چراغ روشن کیا تو دونوں کے چہروں کے نقوش صاف ہوئے۔ کمرہ بہت کشادہ تو نہ تھا مگر کام چلاؤ اور محدود سامان نے جو روزمرّہ کے استعمال کا تھا کمرے کو چھوٹا محسوس ہونے سے بچا لیا تھا۔ نشست کے لیئے جو تخت تھا اسکے ساز و سامان میں البتہ نمائش کی خواہش کارفرما تھی۔ تخت کے پُشت کی دیوار پر ایک تلوار سجی ہوئی تھی ، شیخ تخت پر دراز ہو گیا اور

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

اسکا ساتھی پیتیانے دیوار کی ٹیک لگا کر بیٹھ ہی رہا تھا کہ شیخ گویا ہوا۔

"ہمارے بزرگوں کے حاکم نے کسی بات پر خوش ہوکراونٹوں کی نادرونایاب نسل کا ایک جوڑا ہمارے جدّ امجد کو دیا تھا یہ اونٹنی کا بچہ اسی کی چوتھی نسل ہے۔" اسی وقت ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور کہیں بجلی چمکی، شیخ کے ساتھی نے اٹھ کر کواڑ بند کر دیئے تو شیخ نے اسے بتایا۔

"کل اپنی کامیابی کے بعد میں اسکو ذبح کردونگا۔"

"اسکو کیوں؟"

"کیونکہ نہ تو یہ سواری ہی اٹھا سکتا ہے نہ سامان، ابھی اسکی دودھ دینے کی بھی عمر نہیں ہے۔ ذبح کرنے میں پھر کیا تامل ہوسکتا ہے۔"

نوجوان کی نگاہیں اس درمیان روشن دان پر لگی ہوئی تھیں۔ باہر گھورتے ہوئے وہ بولا۔

"غبار اُٹھ رہا ہے، طوفان آئے گا۔" شیخ نے اپنے انداز میں جملے کالُطف لیا اسکی آنکھیں کسی خیال سے چمک اٹھیں وہ کسمسایا

"ہاں مجھے بھی یقین ہے، طوفان تو آئے گا۔" نوجوان شیخ کا اشارہ سمجھ تو گیا مگر وہ اصل موضوع پر قائم رہا۔

"یہ جانور واقعی عمدہ نسل کا ہے۔" شیخ نے سُن کر داڑھی میں انگلیوں سے کنگھی کی اسکی آنکھوں میں مفکّرانہ سنجیدگی در آئی پھر وہ پوری طرح سے تخت پر دراز ہوکر چھت کو گھورنے لگا۔ اسکی ڈوبی ہوئی سی آواز نکلی

"اس بچے کے بزرگوں کا مالک ایک داستان بن چکا ہے، میرا باپ بیان کرتا تھا کہ بیس برس تک عجیب وغریب لفظوں نے اسکی ہمرکابی کی۔ بیس برس تک وہ جس سمت بھی نگاہ ڈالتا وہی الفاظ اسکے حلق سے نکلتے۔"

"کیسے الفاظ۔"؟ سوال پر شیخ یادداشت کو ٹٹولتا ہے اور اس حاکم کے الفاظ دُہراتا ہے

"میں دیکھ رہا ہوں کہ نظریں اٹھی ہوئی ہیں، گردنیں اونچی ہوتی جارہی ہیں اور پیدا کرنے والے کی قسم مجھے صاف نظر آرہا ہے کہ سروں کی فصل پک چکی ہے اور کٹائی کا وقت

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

آ گیا ہے۔میری نظریں وہ خون دیکھ رہی ہیں جو پگڑیوں اور داڑھیوں کے درمیان بہہ رہا ہے۔'' یہ کہہ کر شیخ چپ ہوگیا،نوجوان نے اپنی پگڑی اتاری کچھ دیر سر کھجایا پھر تردُد کے ساتھ بولا

''میں ان لفظوں کا مطلب نہیں سمجھ پایا۔'' شیخ اسے دیکھتا رہا پھر اٹھ کر بیٹھ گیا دیوار سے تلوار اتاری، نیام سے باہر نکالی تو چراغ کی مدھم روشنی میں بھی وہ لپلپا اٹھی شیخ اسکو کچھ اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے کوئی باپ ناز و نعمت سے پالی ہوئی اولاد کو دیکھتا ہے پھر دھیرے سے بولا

''معنی کی اوقات اُس لفظ کے تئیں تیری آمادگی کے درجے پر منحصر ہے، اگر کسی لفظ نے اپنی قوت سے تجھے اسکے تئیں آمادگی کے بلند ترین درجے پر پہنچا دیا ہے تب تُو بھی پگڑیوں اور داڑھیوں کے درمیان بہتے ہوئے خون کو دیکھ سکتا ہے۔''

یکایک شیخ کے کان کھڑے ہو گئے اور وہ بھیڑیے کی طرح چوکنا ہو گیا۔نوجوان نے لپک کر دوسری جانب دیوار پر ٹنگی تلوار چشم زدن میں کھینچ لی، دونوں دبے پاؤں دروازے کی جانب بڑھے اور دروازے کے دائیں اور بائیں پٹوں سے لگ کر کھڑے ہو گئے۔ کچھ دیر یونہی دم سادھے باہر کی آہٹ لینے کی کوشش کرتے رہے۔جس قدر وہ کان لگاتے باہر کا سناٹا اتنا ہی پُراسرار ہوتا جاتا۔ یکایک دونوں نے ایک ساتھ دروازے کے پٹوں کو بجلی کی چمک کی رفتار سے کھولا اور باہر ٹوٹ پڑے۔ باہر کچھ نہ تھا۔صرف شمال سے چلنے والی کچھ منہ زور ہوائیں تھیں اور بسیرے کی تلاش میں سائبان کی چھت سے لٹکتے تازہ وارد اور بھٹکے ہوئے چمگادڑوں کا ایک جوڑا۔ وہ دونوں اطراف کا گہرا جائزہ لیکر مکان میں واپس لوٹ گئے۔

''مجھے اچھا لگا۔'' شیخ نے اعتراف کیا

'کیا؟'' نوجوان نے جاننا چاہا

''تو عقاب کی طرح جھپٹ سکتا ہے۔مگر یاد رہے پہلی ضرب میری ہوگی''۔ شیخ نے پگڑی اتاری، تلوار سرہانے رکھی پھر نوجوان کے چہرے کا کچھ دیر جائزہ لیتا رہا جو مٹکے سے پانی نکال کر پی رہا تھا۔

'' تجھے بھوک تو نہیں لگی ہے؟''

''نہیں۔''

''یہی جواب درست ہے'' شیخ نے اطمینان کا اظہار کیا۔'' یہ موقع بھوک پیاس

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

بھلا دیتے ہیں۔ہم شب کے آخری حصے میں اٹھیں گے، گاڑھا اور گرم دودھ پئیں گے پھر منزل"۔

"میں آنگن میں لیٹ رہا ہوں۔" نوجوان نے پشت کے دروازے کی طرف قدم بڑھائے

"آنگن میں۔؟" شیخ چونکا۔

"دیواروں کی منڈیروں پر نظر رکھونگا۔ بستی میں کچھ لوگ مشکوک نظر سے دیکھ رہے تھے۔"

شیخ نے فرط جذبات سے مغلوب ہوکر نوجوان کو معانقہ کے لئے اپنی طرف کھینچا کان کے پاس ہونٹوں کو جنبش دی

"تیری شب بیداریاں یادرکھونگا"۔

نوجوان پشت کی جانب پھیلے ہوئے صحن کی طرف چلا گیا جہاں دور چمکتی ہوئی برق کی پھلجھڑیاں پھوٹ رہی تھیں۔شیخ نے چراغ گل کرنے کا قصد کیا مگر پھر کچھ سوچ کر ارادہ ملتوی کر کے بستر پر دراز ہو گیا۔آنکھیں پچھلی شب بیداریوں کا شمار کرنے کے لئے چھت پر ٹکی ہوئی تھیں۔

معدوم ہوتی روشنی کے ساتھ منظر تبدیل۔

کھجوروں کے جھنڈ میں ایک خیمہ، رات کی خاموشی اور اندھیرا۔ خیمے کے اندر مسافرت طے کر کے آنے والی نوجوان لڑکی پیالے میں قہوہ انڈیل رہی ہے، باہر مرد بجھتی ہوئی آگ کو نئی زندگی دینے کا کام ختم کر چکا ہے۔لڑکی اسے آواز دیتی ہے،مرا ندر جاتا ہے۔دونوں کے بدن پر جدید طرز کا لباس ہے۔مرد کا منہ لٹکا ہوا ہے چہرے پر فکرمندی ہے،لڑکی مرد کا چہرہ پڑھتی ہے قہوہ دیتے ہوئے بولتی ہے۔

"تم کس سوچ میں ہو۔؟"

"سوچا تھا نہ بتاؤں، خوف زدہ ہوجاؤ گی۔" مرد رُکا،لڑکی کی آنکھوں میں الجھن ابھر آئی وہ مرد کے چہرے سے نظریں ہٹائے بغیر بات پوری ہونے کی منتظر رہی تو مرد گویا ہوا۔

"یہاں کچھ غیر معمولی ہونے والا ہے۔" پھر وہ بھد سے بستر پر بیٹھ گیا۔

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

''تمھارے پیچھے ایک اجڑ سا آدمی خیمے پر آیا تھا، مجھے خوف زدہ کر کے کہہ گیا، تمھیں صرف دیکھنے کی اجازت ہے، بولو گے تو زبان کاٹ دی جائے گی۔''

لڑکی نو جوان تو ضرور تھی مگر اسکی ذہانت نے اسکے ساتھی اداکار سے جو اداکاری میں زیادہ تجربہ رکھتا تھا اور لڑکی کو کچھ معنوں میں پسند بھی تھا یہ بحث کی تھی کہ فلم میں اسکے کردار کا کیا جواز ہے۔

''ہم الیوژن create کرر ہے ہیں کردار سازی نہیں۔'' بحث اس جواب پر ختم ہو گئی تھی منظر مین قہوے کے برتن سمیٹتے وقت اسے ایک پل کو اس بحث کا خیال بھی آیا تھا مگر وہ منظر کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے فولڈنگ کرسی پر بیٹھ کر جوتے کے تسمے کھولتے ہوئے بولی۔

''ہم یہاں اس لئے بھیجے گئے ہیں کہ اس خطے میں مبنی بر انصاف معاشرے کی تلاش کریں اسکی کیفیت کو سمجھیں ہم یہاں باقائدہ اجازت لیکر داخل ہوئے ہیں۔'' مرد لڑکی کی بات سن کر شرارت سے مسکراتا ہے پھر اس کے پاس آتا ہے اسکی پشت پر پہنچ کر اپنی دونوں بانہیں اسکے گلے میں ڈال کر بڑے رومانی انداز میں مخاطب ہوتا ہے۔

''قدرت کا اس سے بڑا انصاف اور کیا ہوگا کہ تم میں شعلہ جوالہ کی طرح ہے، آنکھوں میں ستاروں کی چمک ہے پر فضا سبزہ قدم بوسی میں اور مہربان آسمان سایہ فگن اور تمھارے تلوں کو بوسہ دینے والا ایک سودائی تمھاری سانسوں سے بھی قریب ہے۔'' لڑکی مرد کے عاشقانہ مکالمے کا جواب اسی شرارت سے یوں دیتی ہے۔

''بس تب ہی خیمے کا پردہ اٹھتا ہے، ایک نقاب پوش برہنہ تلوار لئے اندر جھپٹتا ہے اور تمھارا سر قلم کر دیتا ہے اور میں لرزتی اور کانپتی ہوئی تمھارے تن سے جدا سر کو دیکھ کر سوچتی ہوں۔ آدمی کو کیا چاہئے، صرف دو گز زمین۔''

مرد جواب تک لڑکی کو باہوں میں بھرے تھا اپنی بانہیں بھینچ لیتا ہے۔

''تم نے دیکھا؟'' وہ سنجیدہ ہو کر سوال کرتا ہے۔

''کیا۔؟''

''انتخاب کا کرشمہ، اسکی اہمیت۔''

''کیا مطلب؟'' لڑکی وضاحت طلب کرتی ہے

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

''مطلب خیال کا وجود تمھیں ایک جگہ چھوڑ کر دوسری جگہ کھڑے ہونے کی آسانی فراہم کرتا ہے یہ ایک جانبداری کو فتح کر دوسری جانبداری میں شمولیت کا کھیل ہے۔'' پھر وہ ایک ہاتھ سے لڑکی کے دمکتے ہوئے چہرے پر بالوں کی لٹ ہٹاتے ہوئے بات پوری کرتا ہے

''انتخاب کی قلت کسی مخفی تشدد سے دوستی کر لیتی ہے۔ صرف فرشتے ہی اس عذاب سے محروم ہیں۔ کہ انھیں انتخاب کی آزادی نہیں''

مرد خیمے کے دائیں کونے میں جاتا ہے اور اندر کی کھولن کو دباتے ہوئے دانت پیسکر بڑبڑاتا ہے۔

''دوگز زمین۔ ایک بار پھر اس لفظ کو زور دیکر دہراتا ہے۔ دو/ گز/ زمین۔

اسے یاد آتا ہے کہ کچھ ہی دن پہلے وہ چیخوف کے ڈرامے کا ایک کردار ادا کر رہا تھا، تب روح کی تمام تر بے چینی کے ساتھ اسے چیخوف کا یہ مکالمہ ادا کرنا پڑا تھا۔

''آدمی کو محض دوگز زمین نہیں چاہئے سارا کرۂ ارض چاہیے، سارا عالم فطرت چاہیے جس کی بے کنار پہنائیوں میں وہ اپنی بے قید اور بے زنجیر روح کو تمام جلوے اور تمام صفات دکھا سکے۔'' [1]

وہ اس فولڈنگ میز کے قریب کھڑا ہو جاتا ہے جہاں لیمپ کی روشنی میں پھیلے ہوئے کاغذات کے درمیان ایک سفری ٹائپ رائٹر رکھا ہے۔ وہ کاغذات کو الٹتا پلٹتا ہے، پھر تیوریاں چڑھا کر لڑکی کی جانب متوجہ ہوتا ہے۔

''یہ تم کو کس نے سمجھا دیا کہ ہم یہاں مبنی بر انصاف معاشرہ تلاش کرنے آئے ہیں۔''

''ایسا نہیں ہے تو کیا جھک مارنے آئے ہیں؟'' لڑکی بھنا جاتی ہے

''ہم اس معاشرے کے الفاظ تلاش کرنے کے لئے بھیجے گئے ہیں''

''الفاظ۔؟'' لڑکی آنکھیں پھاڑتی ہے

''ہاں، انکے حلق میں جو الفاظ بھرے ہوئے ہیں انکا ارتعاش سننا ہے ہمکو۔''

---

[1] ترجمہ۔ ظ۔ انصاری۔

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

لڑکی جھنجھلا کر بستر پر ٹھوکر مارتی ہے
''ڈیم اِٹ۔سویرا ہونے کو ہے،کیا سونا نہیں ہے؟''۔
''نہیں۔'' مرد سنجیدگی سے جواب دیتا ہے۔''میری چھٹی حس کہہ رہی ہے کہ ہمیں خیمے کو جوں کا توں چھوڑ کر فی الحال نکل لینا چاہئے۔''
''کیوں۔۔؟''لڑکی خوفزدہ نظروں سے ساتھی کو دیکھتی ہے جو خاصہ فکر مند ہے
''ہوسکتا ہے کہ تب میرا سر تن سے جدا پڑا ہو اور تم ایک کونے میں خوفزدہ اور کانپتے بدن سے یہ سوچ رہی ہو کہ آدمی کو کیا چاہئے؟ صرف دو گز زمین؟''
''کیا تم واقعی سنجیدہ ہو؟'' وہ سوال کرتی ہے، جواب میں مرد اسے نظر بھر کر دیکھتا ہے۔لڑکی کے چہرے سے مسافت اور بیداری کی تھکن نے شادابی چھین لی تھی مگر اسکی مضمحل سی متعب اب بھی پُرکشش تھی، مرد پاس آتا ہے۔
''آج ایک بات بار بار زبان پر آرہی ہے۔''
ظاہر ہے مجھے پوچھنا چاہئے کون سی بات؟''لڑکی ترچھی نظروں سے مرد کو دیکھتی ہے مرد اسکے کان میں سرگوشی کرتا ہے۔
''میں تمھیں پیار کرتا ہوں۔''جواب میں لڑکی کے چہرے پر ایک پَل کو ایک تغیّر کپکپاتا ہے۔
''لفظ بدل کر یہ بات کیا پہلے بھی نہیں کہی جا چکی ہے۔؟''لڑکی چہکتی ہے
''نہیں اتنے صاف لفظوں میں نہیں کہا،اب جبکہ مجھ پر یہ منکشف ہوا ہے کہ مجھے تم کو حاصل کرنا چاہئے تو اسی کے ساتھ یہ خیال بھی پختہ ہوگیا ہے کہ مجھے تمکو کھوئے جانے سے بہر طور محفوظ رکھنا ہے۔لیکن زندگی کو نہ تو پائے جانے سے غرض ہے اور نہ کھوئے جانے سے وہ کمبخت تو ان دونوں کے چلن سے دلچسپی رکھتی ہے۔'' مرد نے لڑکی کی کمر میں دونوں باہیں حائل کردیں،دونوں کے چہرے پاس پاس ہیں۔مرد کی آنکھیں انہماک سے لڑکی کی آنکھوں کی گہرائیوں کو ٹٹول رہی ہیں کہ لڑکی مسکراتے ہوئے دریافت کرتی ہے۔
''کہاں چلنا ہے''
''بستی کی طرف چلتے ہیں، کہیں چشمے پر ہاتھ منہ دھوئیں گے۔''

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

لڑکی نے دونوں باہیں اب مرد کی گردن میں ڈال دی ہیں اور ادا سے کہہ رہی ہے "چلو"
روشنی اندھیرے میں تبدیل ہو رہی ہے۔

شیخ چراغ کے سامنے سر اور چہرہ پر پگڑی اس طرح لپیٹ رہا ہے کہ آنکھوں کے سوا تمام چہرہ مکمل طور پر ڈھک جائے۔ ساتھی ہاتھ بٹا رہا ہے۔

"اب کوئی بھی پہچان نہ سکے گا، میرا دعویٰ ہے" نوجوان جو پہلے ہی نقاب میں ہے شیخ کا جائزہ لیکر اطمینان دلاتا ہے اور بڑھ کر شیخ کو تلوار پیش کرتا ہے۔ جھک کر کہتا ہے

"میں خوش قسمت ہوں کہ اس تلوار کی خدمت میں ہوں۔"

مگر شیخ اپنے جواب سے اسے مایوس کر دیتا ہے۔

"اس خدمت کے سبب تو خوش قسمت نہیں ہے۔"

"دوسرا سبب میرے علم میں نہیں۔" ساتھی اعتراف کرتا ہے۔

"تو خوش قسمت اس لئے ہے کہ خرد افروزی کے زہر کا ذائقہ لینے جا رہا ہے اور زہر میں بُجھی اس طاقت کو چھو کر دیکھ رہا ہے، اب تو اس پر تحریر اسمِ اعظم کو پڑھ سکے گا۔" شیخ تلوار کو نیام سے باہر نکالتا ہے۔ اور جھک کر روشنی میں اسکی دھار کی آب پر ایک دھبہ دکھاتا ہے۔

"یہ دیکھ"

اسکے تخاطب میں جوش و خروش ہے" یہ ایک کج کلاہ امیر کے سپہ سالار کا خون ہے۔" نوجوان غور سے اُدھر دیکھتا ہے۔

شب کے اندھیروں میں گھوڑوں پر گھوڑے بدلتے ہوئے اس امیر کی اقلیم تک پہنچی تھی یہ تلوار۔ کیسی درد انگیز حلاوت تھی اسکے سینے میں پہلے اس نے پیش امیر دست بستہ رہنا سیکھا پھر ایک دن اُسی کے سینہ پر اپنی نوک رکھ کر بولی۔

"تُو اب ہماری ایماء کے بغیر اپنی فوج نہیں بڑھائے گا"۔ پھر جانتا ہے کیا کیا اس نے؟ امیر کی ہی چھاتی پر اُسی کے خزانے سے خود اپنی ہی فوج کو پالنے لگی۔ یہ دیکھ یہ اُسی امیر کی جانشینی کے لئے اس تلوار کی بے رحم مگر سرخرو مداخلت کے نشانات ہیں۔ پھر یہ اتنی حرافہ ہوگئی کہ دوسرے کے تخت پر جسکو جب چاہتی بٹھاتی اور جب چاہتی اتار دیتی۔"

نوجوان گرجا۔

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

''کیا وہ امیر بے غیرت تھا؟''

''نہیں'' شیخ نے بھی گلا پھاڑا ''امیر بھوکے شیر کی طرح اپنی ہی بوٹیاں نوچتا اور بے عزتی کی زندگی سے بیزار طبیبوں سے باعزت خودکشی کی تدبیریں پوچھتا اطبا تدبیر بتاتے کہ عالی جاہ دوپہر کے طعام کے بعد فوراً دریا میں نہانا شروع کردیں، کچھ ہی عرصے میں مرض الموت اپنی آغوش میں لے لے گا۔ امیر دوسرے ہی دن سے بعد طعام دریا میں نہانے لگا۔ یہ وہ قطائمہ ہے جو کتنے ہی امیروں کو بعد طعام دریا پر نہانے کے کام پر لگا چکی ہے۔'' یہ سنکر نوجوان کی عجیب کیفیت ہوئی، وہ کمرے میں اضطراب کے ساتھ ٹہلنے لگا اور یکا یک کہہ اٹھا

''قسم ہے دونوں جہان کی، کاش یہ تلوار میری قدرت میں ہوتی تو میں اپنے چہرے کو یوں نہ چھپاتا۔'' یہ سن کر شیخ ایک پل کو مبہوت رہ گیا دونوں خاموش تھے مگر معنی خیز خاموشی اب خاموشی نہ رہ گئی تھی ایک ایک پل میں پراسراریت گھل گئی تھی جب اس پراسراریت کا دم گھٹنے لگا تو شیخ گردن لٹکا کر دھیرے سے منہ ہی منہ میں بڑبڑایا

''کیا کہا تھا تُو نے ابھی، ذرا پھر تو کہہ۔''

''میں نے کہا، کاش یہ تلوار میری قدرت میں ہوتی تو میں یوں چہرے کو ڈھاٹا باندھ کر نہ چھپاتا۔'' وہی جواب پھر سن کر کئی پل امیر نوجوان کے چہرے پر آنکھیں گڑائے رہا پھر یک بارگی نقاب نوچی پگڑی سر سے دور پھینکی اور غضب ناک ہو کر بولا۔

''اپنی ماں کے دودھ کی قسم میں برہنہ سر اور بے نقاب جاؤں گا۔'' پھر اس نے پیر پٹک کر خود کو کوسا۔ ''ارے بدبخت تو کیوں بھول گیا کہ پگڑیاں حمالوں کے سروں کو اور نقابیں چوروں کے چہروں کو چھپانے کے لئے بنی ہیں۔'' شیخ غصہ اتار کر مشکوک نظروں سے اپنے ساتھی کو دیکھنے لگا۔ وہ اپنے دل میں پیدا ہونے والے ایک شبہ کو دور کرنا چاہتا تھا۔

''اگر میں اس کام میں فتح یاب ہوا تو کیا تو مجھ سے ڈرنے نہیں لگے گا؟''

''میں فتح پر خوش ہونگا۔'' جواب سن کر شیخ کے ہونٹوں پر تلخ مسکراہٹ دوڑ گئی، بولا

''بے شک تُو بے جگر ہے، مگر اناڑی بھی ہے، کمبخت نہیں جانتا کہ فتح اپنا شکم پہلے اپنے ہی یاروں کو کھا کر بھرتی ہے۔'' یہ کہہ کر شیخ نے تلوار پر گرفت کسی اور قدم میدان کارزار کے لئے دہلیز سے باہر ڈال دیا۔

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

باہر کے اندھیرے نے دھیرے دھیرے دونوں کو نگل لیا۔

خیمہ زن مرد و زن ایک چشمے کے قریب جھاڑیوں کی اوٹ میں بیٹھے محسوس کئے جا سکتے ہیں، کچھ فاصلے پر دھند لکے میں ایک عمارت کا صدر دروازہ سا دکھائی دے رہا ہے جو یا تو کوئی ایوان ہے یا مدرسہ یا عبادت گاہ۔ غور کئے جانے پر عمارت کے اندر لوگوں کی موجودگی کا گمان ہوتا ہے۔ یکا یک دو ہیولے تلواروں کے ساتھ ایک سمت سے ابھرتے ہیں اور گھات لگا کر عمارت کے صدر دروازے کی جانب بڑھتے ہیں۔ کم روشنی میں نہ تو ان کے حُلیہ کی شناخت ممکن ہے اور نہ چہرے کے نقوش کی، دونوں سائے کے مانند متحرک ہیں اور عمارت کے صدر دروازے تک چوکنا ہو کر پہنچنے کی کوشش میں ہیں۔ عمارت کے آس پاس سوائے چند ٹیلوں اور قدرے دور افتادہ مکانوں کی منڈیروں کے اور کچھ نظر نہیں آ رہا ہے، سناٹے میں کبھی کبھی صدر دروازے سے کچھ دبی دبی آوازیں اٹھتی محسوس ہوتی ہیں۔ چشمے کے قریب جھاڑیوں کے آگے خیمہ زن لڑکی کی توجہ تلوار بازوں کے متحرک سایوں کی جانب اب مرکوز ہوگئی ہے۔ وہ مرد کو اپنے مشاہدے میں شریک کرنا چاہتی ہے جو لڑکی کے گھٹنے کے معمولی زخم پر مرہم لگا رہا تھا۔ لڑکی مرد سے تصدیق چاہتی ہے۔

''غالباً انکے ہاتھوں میں تلواریں ہیں۔''

''نہیں تو۔'' لڑکا سرسری طور پر دیکھ کر جواب دیتا ہے، لڑکی پھر ادھر آنکھیں گڑا کر سوال کرتی ہے۔

''تلواریں نہیں تو پھر کیا ہے۔؟''

''دوا ہے، دوا۔'' لڑکا اطمینان سے جواب دیتا ہے۔

''دوا ہے۔؟'' لڑکی کو ہنسی آ جاتی ہے

''ہاں۔ لائف سیونگ ڈرگ (Life Saving Drug) جس کو ہم تم اینٹی بائنک بھی کہتے ہیں''۔

''تم پاگل ہو، انکے ہاتھوں میں تلواریں صاف نظر آ رہی ہیں۔'' لڑکی غور سے دھندلکے کی جانب دیکھ رہی ہے لڑکا اسے ہلکے پھلکے انداز میں سمجھانے کی کوشش کرتا ہے۔

''جو مرہم میں نے ابھی تمہارے زخم پر لگایا ہے یہ زخم کے جراثیم کے خلاف ایک

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

تلوار ہے۔یعنی زخم کے دفاع کے لئے ANTI SEPTIC"

تب تک دونوں سائے صدر دروازے کے قریب پہنچ گئے تھے مشرق کی سمت سے اندھیرا چھٹنے لگا تھا اور یہ صاف دیکھا جا سکتا تھا کہ تلوار بازوں کے سروں پر پگڑیاں نہیں تھیں۔تلوار باز عمارت کے دروازے کی چوکھٹوں سے لگ کر دائیں اور بائیں دُبک کر کھڑے ہو چکے تھے۔لڑکی کو صورتِ حال کی سنگینی کا اندازہ غالباً ہو چکا تھا وہ خوف زدہ لہجے میں پھسپھسائی۔

"یہاں کچھ بھیانک ہونے والا ہے۔"

"بھیانک کیا ہوگا" لڑکا بے تعلقی سے مخاطب ہوا "جس پر حملہ ہوگا اس نے بھی بچاؤ کے لئے کوئی لائف سیونگ ڈرگ رکھ ہی چھوڑی ہوگی۔"

"میں کہتی ہوں یقیناً کچھ ہوگا۔"

"ہاں ہوگا تو۔" لڑکا کچھ رک کر بولا۔"اس لئے ہوگا کہ ایسی دواؤں پر بھی ایک EXPIRY DATE یعنی مدتِ معیاد لکھی ہوتی ہے جس طرح تمھارے مرہم کے ٹیوب پر لکھی ہے مگر ان دواؤں پر لکھی مدتِ معیاد دکھائی نہیں دیتی۔" مرد کچھ سوچ کر ہنسا پھر بولا

"کتنی عجیب بات ہے، ان دواؤں کی روپوش مدتِ معیاد انجانے میں گزر بھی جاتی ہے لیکن اس مدت کے بعد بھی ہم انھیں اس یقین کے ساتھ استعمال کرتے رہتے ہیں کہ وہ ٹھیک کام کریں گی جبکہ وہ ویسا کام نہیں کر پاتیں جیسا اپنی معیاد کی مدت کے اندر کرتی تھیں۔"

اسی وقت عمارت کے صدر دروازے کی دہلیز پر کوئی اندر کی جانب سے باہر آیا آنے والے نے دائیں بائیں ننگی تلواریں تھامے دو لوگوں پر اچٹتی سی نگاہ کی اور آگے چل پڑا اگر چہ باہر برآمد ہونے والے کا سر ننگا نہ تھا مگر اس پر کوئی بھاری پگڑی بھی نہ تھی، اسکے دونوں ہاتھ بھی خالی تھے اور ان میں کوئی اسلحہ نظر نہ آ رہا تھا۔بس اسی اثناء میں بائیں جانب سے ایک تلوار بلند ہوئی اور برآمد ہوئے شخص کے سر پر مشاق ہاتھ کی ضرب پڑی، ضرب اسقدر کاری تھی کہ آنے والا سنبھل نہ سکا، وہ لڑکھڑایا ہی تھا کہ اسی ہاتھ نے پھر وار کیا۔دا ہنی جانب رُکے ہوئے آدمی نے حملہ کرنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ عمارت کے اندر سے دو تین لوگ باہر کی جانب پھاند پڑے اور دیکھتے ہی دیکھتے شور شرابہ ہونے لگا اس افراتفری کی حالت میں

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

ایک حملہ آور جس نے تلوار ماری تھی قابو میں کر لیا گیا مگر دوسرا کسی طرح بھاگ نکلا۔ اس چیخ پکار نے اندھیرے سے اب نمودار ہو رہے مکانوں کے دروازے ہلائے تو کچھ مرد اور عورتیں اس بستی سے جائے وقوع کی جانب بھاگتے دوڑتے نظر آنے لگے۔

چشمے کے قریب بیٹھی خوفزدہ لڑکی بدحواس ہو کر پوچھ بیٹھی

"اس نے تلوار کیوں ماری۔" مرد نے سمجھایا

"ممکن ہے مدتوں اسکو یہ باور کرایا گیا ہو کہ حق پر قائم رہو چاہے اس کے لئے تمھیں تلوار ہی کیوں نہ اٹھانا پڑے۔" لڑکی نے جرح کی

"مگر آنے والے نے تو تلوار بازوں کو دیکھ لیا تھا پھر وہ ڈرا کیوں نہیں۔" مرد نے پھر سمجھایا

"ممکن ہے اسکو مدتوں یہ باور کرایا گیا ہو کہ حق پر قائم رہو چاہے اسکے لئے تمھیں اپنا سر ہی کیوں نہ دینا پڑے۔ لڑکی اسے بے یقینی سے دیکھنے لگی۔

" جلدی چلو یہ موقعہ ہماری تلاش کے لئے مددگار ہو سکتا ہے" مرد نے لڑکی کا ہاتھ اپنی طرف کھینچا، وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اٹھی، پھر وہ دونوں تیز قدموں سے اس جانب رواں تھے۔ یکایک مرد خوشی کا اظہار کرتے ہوئے بول پڑا

"اب تم لفظوں کا ارتعاش سُن سکو گی۔"

"ارتعاش۔" لڑکی بھنا گئی" کیا تم سیدھی بات نہیں کر سکتے یا مجھ پر رعب ڈالتے رہتے ہو۔"

چند ساعتوں میں وہ دونوں اس انتشار کا حصہ بن چکے تھے۔ ان کے قریب پہنچے اور لوگوں کے چہرے صاف ہونے پر تماشائی حملہ آور کی شناخت کر لیتے ہیں۔ وہ شیخ ہے جو اندھیرے میں اپنے ساتھی کے ساتھ تلوار سونت کر ننگے سر گھر سے نکلا تھا۔ کوئی خاتون زخمی کے پاس زمین پر بیٹھی واویلا کر رہی تھی، کچھ لوگ اسے سمجھانے میں لگ گئے تھے دوسری طرف چند لوگوں نے حملہ آور کو بری طرح جکڑ رکھا تھا اور پشت پر اسکے ہاتھوں کو کلائیوں سے باندھنے میں لگے تھے، حملہ آور کے سر کے بال اب بکھر چکے تھے اور داڑھی پسینہ سے تر تھی لیکن چہرے پر ہراس نہ تھا اور آنکھیں اپنی کامیابی پر نازاں تھیں۔ یکایک خاک پر چھاتی پیٹتی

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

عورت غضب ناک ہو کر حملہ آور کی جانب پلٹی اور غیظ و غضب سے بولی

''ارے بد بخت یہ تو نے کیا کیا، ہمارے امیر کو زخمی کر دیا۔''

''قسم ہے اپنی ماں کے دودھ کی یہ بچے گا نہیں۔'' شیخ گرجا

''تیرے منہ میں خاک'' خاتون غصہ میں شیرنی کے مانند اس پر جھپٹی مگر کسی نے مزاحمت کر کے اسے روک لیا۔ شیخ نے مجھ کو مخاطب کیا۔

''تم سب دیکھو گے کہ یہ زندہ نہ رہے گا، سخت موسموں کو سہہ کر مہینوں بڑا قاتل زہر میں نے تلوار کی دھار میں اتارا ہے۔'' کچھ لوگ چارپائی لے آئے تھے، زخمی کے سر سے بہتا ہوا خون اسکے ماتھے اور داڑھی کو بھگوتا ہوا لباس کو داغدار کر چکا تھا اور اس پر نقاہت کی غشی طاری ہونے لگی تھی۔ شیخ کے مخاطبے سے پیدا ہونے والے خدشہ نے ایک نوجوان کو ایسا مشتعل کیا کہ اس نے تلوار کھینچ لی۔ مگر زخمی نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا اور نحیف آواز میں بولا

''اسے گزند نہ پہنچانا، مر جاؤں تو چاہئے قصاص لینا یا معاف کر دینا۔ معافی کا مقام قصاص سے بلند ہے۔''

لوگ زخمی کو چارپائی پر لٹاتے ہیں اسی اثنا عورت سر پیٹ کر چلاتی ہے۔

''تو کیا تو نے ہمارے امیر کو قتل کر دیا۔''

شیخ نے دانت پیسے

''امیر کو نہیں۔ میں نے لفظ کو قتل کیا ہے۔ اسکے ساتھ اسکے لفظوں کا سونا مٹی ہو جائیگا۔''

عورت نے پچھاڑیں ماریں

''ہائے لوگو، اس مردود نے حق کو مغلوب کر دیا۔''

شیخ نے احتجاج کیا

''حق غالب نہیں آتا، لفظ غالب آتا ہے۔ زمین پر کان لگا کر سن، آہٹیں واضح ہو چکی ہیں۔'' اسی وقت مجمع سے ایک بزرگ سیرت جسکی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور جسے ایک نوعمر لڑکا سنبھالے تھا چھوٹے چھوٹے قدموں سے آگے بڑھتا ہے، قاتل کے قریب آتا ہے اور بھرّائی آواز میں گویا ہوتا ہے

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

"کیا تُو لفظ کی توقیر سے واقف ہے؟"

"میں نے فرزانوں کی جوتیاں ہی سیدھی کی ہیں۔ اور تلواروں کے دھبّوں کو پڑھنے میں آنکھیں پھوڑی ہیں۔"

"تو شناخت بیان کر۔" بزرگ عجلت سے سوال کرتا ہے

"جسکے سینہ میں منصوبہ بند تشدد پلے اسکو لفظ کہتے ہیں۔"

"منصوبہ بند تشدد کا انجام بھی جانتا ہے؟"

جواب آتا ہے

"تصادم۔"

سوال ہوتا ہے

"تصادم کا انجام؟

"کسی نئے لفظ کی تاج پوشی یا کسی پرانے کی حفاظت۔"

پھر کچھ دیر نہ سوال ہوتا ہے اور نہ جواب ایک عجیب سی خاموشی چھا جاتی ہے جو بزرگ کے گریبان پھاڑنے پر ٹوٹتی ہے وہ مشرق کی سمت دیوانہ وار چیختا ہوا بھاگتا ہے۔ پھر بیٹھ کر زمین پر کان لگاتا ہے یکا یک چلاتا ہے۔

"زمین کہہ رہی ہے لفظ خطا کرتا ہے تو بستیاں گھوڑوں کی ٹاپوں سے پامال ہوتی ہیں لاشوں پر چیل کوّے منڈلاتے ہیں"۔ بزرگ بھاگتا جاتا ہے اور بڑبڑاتا جاتا ہے،

"یہاں تک کہ نیکیاں پناہ ڈھونڈتی ہیں"

وہ ٹھوکر کھا کر زمین پر اوندھے منہ گر پڑتا ہے۔

فلم ختم ہو چکی تھی، دونوں openion makers کو یہ سن کر خوشی ہوتی تھی کہ حق غالب نہیں آتا بلکہ لفظ غالب آتا ہے اور غالب آنے والے لفظ سونے کی اشرفیوں کی طرح فی الحال ان کی مٹھیوں میں دبے تھے۔

(۱۹۹۸ء)

□□□

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس کی اہم مطبوعات

ادب و تنقید

کتاب	مصنف
تاریخ ادب اردو (آغاز سے اٹھارہویں صدی تک) (تین جلدوں پر مشتمل)	جمیل جالبی
مثنوی کدم راؤ پدم راؤ	جمیل جالبی
ارسطو سے ایلیٹ تک	جمیل جالبی
نئی تنقید	جمیل جالبی
ادب، کلچر اور مسائل	جمیل جالبی
محمد تقی میر	جمیل جالبی
ایلیٹ کے مضامین	جمیل جالبی
معاصر ادب	جمیل جالبی
ادبی تحقیق	جمیل جالبی
میراجی ایک مطالعہ	جمیل جالبی
تنقید و تجربہ	جمیل جالبی
قومی ڈکشنری (انگلش۔اردو)	جمیل جالبی
بوطیقا (تصنیف ارسطو) ترجمہ	جمیل جالبی
ڈاکٹر جمیل جالبی ایک مطالعہ	گوہر نوشاہی
شاہ عالم ثانی آفتاب احوال و ادبی خدمات	ڈاکٹر خاور جمیل
ساختیات پس ساختیات اور مشرقی شعریات	گوپی چند نارنگ
اردو افسانہ روایت اور مسائل	گوپی چند نارنگ
گوپی چند نارنگ۔حیات و خدمات	ڈاکٹر سید حامد علی
ادبی تنقید اور اسلوبیات	گوپی چند نارنگ
اقبال کا فن	گوپی چند نارنگ
امیر خسرو کا ہندوی کلام	گوپی چند نارنگ
انیس شناسی	گوپی چند نارنگ
اسلوبیات میر	گوپی چند نارنگ
سانحۂ کربلا بطور شعری استعارہ	گوپی چند نارنگ
سفر آشنا	گوپی چند نارنگ
لمحہ لمحہ زندگی	محمود واجد
داماں باغباں	قرۃ العین حیدر

کتاب	مصنف
اردو کی ظریفانہ شاعری اور اس کے نمائندے	فرمان فتحپوری
اردو نثر کا فنی ارتقاء	فرمان فتحپوری
اردو شاعری کا فنی ارتقاء	فرمان فتحپوری
اقبال سب کے لئے	فرمان فتحپوری
تاریخ ادبیات عالم (پانچ جلدیں)	وہاب اشرفی
قطب مشتری اور اس کا تنقیدی جائزہ	وہاب اشرفی
معنی کی تلاش	وہاب اشرفی
آگہی کا منظر نامہ	وہاب اشرفی
راجندر سنگھ بیدی کی افسانہ نگاری	وہاب اشرفی
کشف الحقائق	وہاب اشرفی
شاد عظیم آبادی اور ان کی نثر نگاری	وہاب اشرفی
حرف حرف آشنا	وہاب اشرفی
اردو فکشن اور تیسری آنکھ	وہاب اشرفی
تفہیم البلاغت	وہاب اشرفی
ہندوستانی محاورے	محمد حسن
ہندوستانی شاعری	محمد حسن
ہندی ادب کی تاریخ	محمد حسن
ترقی پسند ادب، پچاس سالہ سفر	قمر رئیس
تعبیر و تحلیل	قمر رئیس
اصول تحقیق و ترتیب متن	تنویر احمد علوی
ابتدائی کلام اقبال	گیان چند جین
کھوج	گیان چند جین
پرکھ اور پہچان	گیان چند جین
قاضی عبدالودود بحیثیت مرتب متن	گیان چند جین
اوپندر ناتھ اشک	گیان چند جین
کرشن چندر کی ناول نگاری	ڈاکٹر اعجاز علی راشد
اختر الایمان مقام اور کلام	ڈاکٹر محمد فیروز

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3108, VAKIL STREET, KUCHA PANDIT, LAL KAUN, DELHI-6 (INDIA)
PH: 23216162, 23214465 FAX: 011-23211540
E-MAIL: ephdelhi@yahoo.com
81-87667-75-3

Scanned by CamScanner